مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۷ | ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ | فروری ۲۰۱۶ء | شمارہ ۲

خیر المال للرجال

بہترین مال اعمال صالحہ ہیں

از افادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۲۰ روپے　　زر سالانہ =/۲۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر: جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

خیر المال للرجال

بہترین مال اعمال صالحہ ہیں

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	علم اور عمل	۹
۲.....	استحقاق اور فضل	۱۲
۳.....	شغل اور استغراق	۱۴
۴.....	غم اور فکر	۱۵
۵.....	چند لطائف	۱۶
۶.....	وضو کی خوبی	۱۷
۷.....	بناوٹی پیروں کا دھکوسلا	۱۷
۸.....	صاحب دل کے کلام کا اثر	۱۸
۹.....	محبت اور عمل	۱۸
۱۰.....	قابل اعتبار محبت	۱۹
۱۱.....	عوام کے اعتقاد کا حال	۲۰
۱۲.....	نادان کی دوستی	۲۱
۱۳.....	اتباع سبب ہے سچی محبت کا	۲۳
۱۴.....	احکام و آثار	۲۳
۱۵.....	قابل اعتبار محبت	۲۴

۱۶.....	غزوہ احد	۲۴
۱۷.....	داخلہ جنت کی خوش فہمی	۲۷
۱۸.....	دین و دنیا کا تعلق	۲۸
۱۹.....	شبہ کا جواب	۳۱
۲۰.....	اہل اللہ کی حالت	۳۲
۲۱.....	اسمائے الٰہی کے جلالی و جمالی ہونے کی حقیقت	۳۲
۲۲.....	غضب الٰہی میں پوشیدہ رحمت	۳۳
۲۳.....	اہل اللہ کے دنیاوی تعلقات کا حال	۳۴
۲۴.....	رزق حلال کا اثر	۳۵
۲۵.....	تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر	۳۶
۲۶.....	دین اور فہم	۳۸
۲۷.....	چند غلط فہمیوں کا ازالہ	۴۰
۲۸.....	مذہب کے بارے میں بے ہودہ خیالات	۴۲
۲۹.....	مذہب کا اثر	۴۴
۳۰.....	کورانہ تقلید	۴۵
۳۱.....	بعثت انبیاء کا مقصد	۴۸
۳۲.....	حضور ﷺ کا حال	۴۸
۳۳.....	کسب حلال اور حب دنیا	۵۰

۳۴.....	علما اور کسب دنیا	۵۱
۳۵.....	علما کے کسب دنیا کا نقصان	۵۳
۳۶.....	علما کا کام	۵۴
۳۷.....	علما وامراء کے اختلاط کا اثر	۵۵
۳۸.....	علما اور تنخواہ	۵۶
۳۹.....	آزمائش علما	۵۸
۴۰.....	اہل اللہ کا استغناء	۶۱
۴۱.....	حکومت سلیمان علیہ السلام	۶۲
۴۲.....	جمعیت قلب	۶۳
۴۳.....	طریق تربیت	۶۶
۴۴.....	کامیابی کے لئے ضرورت برداشت	۶۷
۴۵.....	کامیابی تو کام سے ہوگی	۶۸
۴۶.....	طریق عمل	۶۹
۴۷.....	سختی مشائخ کی حکمت	۷۱
۴۸.....	عادت اللہ	۷۲
۴۹.....	ذکر اللہ	۷۴
۵۰.....	ذکر لسانی کا فائدہ	۷۵
۵۱	تجلیات الٰہی	۷۷

۵۲	اظہار احتیاج	۷۸
۵۳	ہر عمل پر اجر	۷۹
۵۴	اصلی مال	۸۰
۵۵	تفسیر آیت	۸۱
۵۶	خلاصہ وعظ	۸۲

وعظ

خیر المال للرجال

بہترین مال اعمال صالحہ ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے وعظ ''خیر المال للرجال'' ۸/ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ کو قلی بازار کانپور میں ارشاد فرمایا جس کا دورانیہ چار گھنٹے تھا حاضرین کی تعداد تقریبا ۵۰۰ افراد تھی۔ مولانا حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری مرحوم نے قلم بند فرمایا۔

موضوع تھا حدیث (المرء مع من احب) کا صحیح مطلب اصلی مال اعمال صالحہ ہیں جن سے دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ مال کے لغوی معنی اعمال صالحہ پر بھی صادق آتے ہیں۔ تجارت مانع آخرت نہیں البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا سے تعلق ضرور کم ہوجاتا ہے جو مفید ہے۔ یہ وعظ تاجروں اور غیر تاجروں سب کے لئے مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۵۔۱۲۔۲۰۱۳ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾(۱)

''خاص بندے ایسے ہیں کہ ان کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی اور وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں قلوب اور آنکھیں الٹ پلٹ ہوجائیں گے۔ ضرور اللہ تعالیٰ ان کو ان کے نیک اعمال کا بدلہ دیں گے اور اپنے فضل سے زیادہ دیں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں روزی بے حساب عطا فرماتے ہیں''۔

علم اور عمل

یہ ایک آیت ہے جو ماقبل سے مرتبط ہے(۲) مگر میں نے اس وقت اسی

(۱) سورۃ النور: ۳۷، ۳۸ (۲) جس کا تعلق گذشتہ کے ساتھ ہے۔

پر اکتفا کیا ہے کیونکہ جس مضمون کا بیان کرنا اس وقت مقصود ہے اس کے لئے یہ آیت کافی ہے۔ رجال ترکیب میں فاعل ہے ،ایک قراءت پر فعل ملفوظ کا ایک صورت میں مقدر (۱) کا جس پر یسبح ماقبل کا فعل دلالت کررہا ہے کیونکہ اس جگہ قراءتیں دو ہیں یسبح بصیغہ معروف اور یسبح بصیغہ مجہول ہے اس قراءت پر یہاں یسبح بصیغہ معروف مقدر کیا جائے گا اس بناء پر میں نے اس کو تلاوت میں یہاں شروع کیا مگر ہر حال میں مطلب ایک ہی ہے یہ سب اس لئے عرض کردیا تاکہ ترکیب معلوم ہونے سے ترجمہ میں آسانی ہو۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ مدح (۲) فرماتے ہیں ان خاص بندوں کی جن میں یہ خاص صفات ہوں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ پس ہم کو چاہیے کہ وہ خاص صفات اپنے اندر پیدا کریں مگر ہم لوگوں کا عجیب مذاق ہے فقط تذکرہ میں تو ان صفات کی مدح کی جاتی ہے مگر ان صفات مدحیہ کی تحصیل نہیں کی جاتی۔

اس کی ایسی مثال ہے، جیسے کوئی شخص اکتساب مال پر (۳) قادر ہو اور اس کے اصول بھی اس کو معلوم ہوں لیکن وہ ان اصول کی صرف مدح ہی مدح (۴) کرتا ہے مگر مال کا اکتساب (۵) نہیں کرتا۔ بتلایئے کہ نری مدح سے اس کو کیا فائدہ مل سکتا ہے یا ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کو کھانے کی حاجت ہے اور سامان بھی کھانے کا موجود ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ کھاؤ مگر وہ ایسا نہیں کرتا ہاں تعریف بہت کررہا ہے کہ اس کھانے سے ایسی قوت آجاتی ہے اور اس سے یہ ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے لیکن باوجود اس کے خود محروم ہے سب کے منہ تک رہا ہے مگر کھاتا نہیں بس تعریف کرنے کو ہی کافی سمجھ رہا ہے۔ انصاف سے کہیئے کہ کوئی شخص دنیا میں اس کو

(۱) ایک صورت میں جو فعل مذکور ہے اس کا فاعل ہے دوسری صورت میں فعل مقدر کا فاعل ہے (۲) تعریف (۳) مال کما سکتا ہے (۴) ان اصولوں کی صرف تعریف ہی کرتا ہے (۵) مال نہیں کماتا۔

عاقل قرار دے گا ہرگز نہیں! مگر تعجب کی بات ہے کہ آج کل دین کے معاملے میں عقلاء اور اہل الرائے اپنے کو عاقل تو سمجھتے ہیں اور اسلام کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ان صفات کی مدح بھی کرتے ہیں جو اسلام نے تعلیم فرمائی ہیں مگر جن صفات کی مدح کی جاتی ہے ان صفات کی تحصیل میں سعی نہیں کرتے دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہ ہوگا جو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور بزرگوں کے اخلاق کی مدح نہ کرتا ہو کہ فلاں ایسے بزرگ تھے اور فلاں ایسے تھے ان میں ایسی اچھی اچھی صفات تھیں کسی مسلمان سے اس کے خلاف نہ سنا ہوگا مگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ تم نے بھی ان خوبیوں کے حاصل کرنے کی طرف توجہ کی تو صاف جواب ملے گا۔ تو کیا محض ان کا معتقد ہوجانا کافی ہے پھر اس سے بڑی سخت غلطی یہ ہے کہ لوگ اس کوتاہی کی تاویلیں کرلیں گے مگر غلطی کا اقرار نہیں کریں گے اگر آدمی غلطی کا اعتراف کرے تو اصلاح کی بھی امید ہے مگر ہم نے تو کلمہ حق اريد به الباطل (کلمہ تو سچ ہے مگر اس سے باطل مراد لیا جاتا ہے) کے طور پر یہ حدیث یاد کرلی ہے۔

المرء مع من احب قاله صلى الله عليه وسلم فى جواب من ساله صلى الله عليه وسلم كيف تقول فى رجل احب قوما ولم يلحق بهم(۱) (رواہ الشیخان)

''جو شخص جس سے محبت رکھے اس کے ساتھ ہوتا ہے اس کو رسول خدا ﷺ نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا جس نے آپ ﷺ سے دریافت کیا۔ آپ ﷺ اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ ایک شخص ایک قوم سے محبت رکھتا ہے اور ان کے ساتھ ملحق نہیں ہے اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا''۔ یعنی جو شخص جس قوم سے محبت رکھے وہ انہیں میں سے ہے کسی نے اس کا ترجمہ نظم میں کرلیا ہے وہ یہ ہے کہ

احب الصالحين ولست منهم　　لعل اللّٰه يرزقنى صلاحا (۲)

(۱) الصحیح للبخاری ۸: ۴۸، ۱۴۹ الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۱۶۵، سنن ابی داؤد: ۱۵۲۷ (۲) میں نیکوں سے محبت کرتا ہوں اور ان میں سے نہیں ہوں شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو نیکی کی توفیق عطا کردیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ اگر کھانے سے کسی کو محبت ہو تو کیا محض محبت سے پیٹ بھر جائے گا وہاں نہیں کہتے۔

احب الاکلین ولست منھم　　لعل اللّٰہ یرزقنی رغیفاً (۱)

کہ میں کھانے والوں کو دوست رکھتا ہوں اسی سے میرا پیٹ بھر جائے گا میں اس شعر کے مصنف پر اعتراض نہیں کرتا اور حاشاء و کلا (۲) حدیث پر تو کون اعتراض کرسکتا ہے میں تو استدلال باطل کرنے والوں پر اعتراض کرتا ہوں اور ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اس کے یہ معنی ہوتے جو آپ نے سمجھے ہیں کہ محبت ہی کافی ہے اور کسی بات کی ضرورت نہیں جیسا آج کل لوگوں نے سمجھ رکھا ہے تو وہ پہلے لوگ بھی یوں ہی رہا کرتے کچھ بھی نہ کرتے بس محبت ہی کا سلسلہ رہتا اور اخیر والے بھی صرف محبت کرتے رسول اللہ ﷺ سے۔ بس کوئی بھی عمل نہ کرتا بس صرف آپ یعنی رسول اللہ ﷺ ہی عمل کر لیتے اور دوسرے لوگ صرف محبت کو کافی سمجھ لیتے مگر ایسا تو نہیں ہوا۔

استحقاق اور فضل

اب رہی یہ بات کہ پھر المرء مع من احب (۳) کے کیا معنی ہیں سو بات یہ ہے کہ اس میں عمل کرنے والوں کے لئے ایک تسلی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جس کو اہل سلوک سمجھ سکتے ہیں باقی جس کو درد ہی نہ ہوا ہو وہ درماں (۴) کی قدر کیا جانے۔ وہ تسلی یہ ہے کہ اہل طریق عبادت کرتے ہیں کوشش کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کمی رہ گئی اور واقع میں کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے اگر کمی محسوس نہ ہو تو یہ بھی برکت عمل اور ترقی کے لئے مانع ہے اس لئے لازم ہے کہ

(۱) کھانے والوں سے محبت کرتا ہوں اور میں ان میں سے نہیں ہوں شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو روٹی عنایت کردیں (۲) خدا کی پناہ خدا نہ کرے (۳) الصحیح للبخاری ۸:۴۸، ۴۹، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ :۱۶۵، سنن ابی داؤد: ۵۱۲۷ (۴) جس کے درد ہی نہ ہوا ہو اس کو دواء کی کیا قدر ہوگی۔

بندہ عمل کے بعد بھی کمی کو محسوس کرے چنانچہ کاملین اس کو محسوس کرتے ہیں حتی کہ رسول اللہ ﷺ بھی کمی کا احتمال فرماتے ہیں۔لا احصی ثناء علیك میں آپ کی تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا۔یعنی میں آپ کی ثناء کا حق ادا نہیں کرسکتا حالانکہ آپ (کے اللہ کی تعریف کرنے) میں فی الواقع کمی نہیں مگر عظمت حق پر (۱) نظر کر کے آپ فرماتے ہیں کہ میں حق ادا نہیں کرسکتا سو یہ کمی اضافی ہے حقیقی نہیں کیونکہ جو درجہ ثناء کا آپ سے مطلوب ہے اور جو طاعت خدا تعالیٰ کو آپ سے مقصود ہے۔ آپ ﷺ سے اس میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہوئی مگر آپ جب عظمت خداوندی پر نظر کرتے ہیں یعنی عظمت حق جس درجہ کو مقتضی ہے جس کے آپ ﷺ مکلّف نہیں ہوئے اور وہ امکان بشر سے (۲) خارج بھی ہے اس کے اعتبار سے حضور ﷺ فرمارہے ہیں۔لااحصی ثناء علیك (۳) اس سے یہ معلوم ہوا کہ کمی کا اپنے اندر محسوس ہونا کمالات میں سے ہے پس جب حضور ﷺ کی یہ حالت ہے تو پھر اولیاء تو کیا چیز ہیں پھر عوام تو کوئی چیز ہی نہیں۔ بہرحال ہم میں طاعت کی کمی ضرور ہے اور اگر اس کمی پر نظر نہیں تو ہمارے اندر خود ایک کمی یہ ہوگی کہ اپنے نقص پر نظر نہیں۔ بہرحال جب ہمارے اعمال پورے نہیں تو ضابطہ کا مقتضا تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ جزا اور اجر بھی نہ ملے ویسے اللہ تعالیٰ فضل فرماویں تو وہ اور بات ہے ان کے فضل کو کون روک سکتا ہے۔ باقی ہم ضابطہ سے جزائے موعود (۴) کے کسی طرح مستحق نہیں۔اور واقع میں مستحق تو اتنی کے بھی نہیں تھے (اگرچہ اعمال میں کمی نہ ہوتی) جتنا وعدہ ہے وعدہ کے اعتبار سے غیر لازم استحقاق ہے مگر اب کمی کی صورت میں اس کے بھی مستحق نہیں۔ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اے اللہ! ہم نے کام ہی کیا کیا ہے پھر جزاء کیسے ملے گی اور یہ سب باتیں موٹی ہیں مگر چونکہ ہم کو فکر نہیں اس لئے

(۱) اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا لحاظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں (۲) انسان کے بس میں بھی نہیں (۳) مسند الامام احمد ۶:۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ۲:۱۷ (۴) نیک اعمال پر جن جزاؤں کا وعدہ کیا گیا ہے ان کے کسی طرح مستحق نہیں۔

ذہن میں نہیں آتیں ورنہ جن حضرات کو فکر ہے ان کی حالت دیکھو۔

خود حضور ﷺ کو دیکھئے کیسے متواصل الفکر تھے(۱)۔ کسی وقت قلب مبارک آپ ﷺ کا بے چینی سے خالی نہ تھا۔ باوجودیکہ حضور ﷺ کی یہ شان تھی کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل، تمام ملائکہ سے افضل اور پھر احتمال باز پرس کا بھی نہیں۔ اول تو اس وجہ سے کہ حضور ﷺ کے اندر کوئی بات باز پرس کی تھی ہی نہیں اگر شاید خود حضور ﷺ کو احتمال بھی ہوتا باز پرس کا تو اس کے بارے میں حضور ﷺ کا اطمینان کردیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے بارے میں فرمادیا: لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیں۔

یہاں ایک عاشقانہ نکتہ ہے وہ یہ کہ حضور ﷺ کے لئے ذنب(۲) کا اطلاق کیا گیا حالانکہ واقعہ میں حضور ﷺ ہر ذنب سے پاک ہیں یہ اس لئے کہ حضور ﷺ کو شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید مجھ سے کچھ گناہ ہوگیا ہو تو اس شبہ کو بھی رفع فرمادیا گیا ہے یہ ایسا ہے جیسے عاشق اپنے محبوب سے رخصت ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میری خطا معاف کردیجئے گا حالانکہ عاشق سے خطا کا احتمال کہاں خصوصاً ایسا عاشق جو عشق کے ساتھ عقل بھی کامل رکھتا ہو اور رسول اللہ ﷺ کی تو بڑی شان ہے۔

شغل اور استغراق

اولیاء اللہ ایسے ہوئے ہیں جن سے باوجود کمال عشق کوئی امر خلاف عقل اور دین کے صادر نہیں ہوا شیخ عبدالحق ردولوی باوجود غایت استغراق کے فرماتے ہیں کہ۔

منصور بچہ بود کہ از قطرہ بفریاد آمد ایجا مردانند کہ دریاہا فرو برند و آروغ ترنند

''منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ (شراب عشق) سے شور وغل کرنے لگا۔ یہاں ایسے (بہادر) مرد ہیں کہ دریا کے دریا پی جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے''

(۱) ہمیشہ فکر مند رہتے (۲) گناہ۔

حضرت شیخ علی احمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بارہ سال تک مراقبہ میں مشغول رہے کچھ ہوش نہ تھا حتیٰ کہ پیر کے یہاں سے مزاج پرسی کے لئے ڈوم آیا تو آپ کو خبر دی گئی کہ شیخ کے یہاں سے ڈوم آیا ہے آپ نے سر اٹھا کر اتنا فرمایا کہ پیر اچھے ہیں؟ کہا جی ہاں! خیریت سے ہیں۔ اور اس کی یہ خاطر کی کہ آپ گولر پھیکے بلانمک کے کھایا کرتے تھے، اس روز فرمایا کہ آج گولروں میں نمک ڈال دینا اس بیچارے کے تو زخم پر نمک چھڑکا گیا وہ تو بڑی بڑی خاطروں کا خوگر تھا اس نے واپس ہو کر شیخ سے بڑی شکایت کی کہ حضرت انہوں نے تو آپ کو بھی زیادہ نہیں پوچھا۔ صرف کچھ دیر کو آنکھیں کھول کر اتنا پوچھا تھا کہ شیخ اچھے ہیں اس کو سن کر شیخ پھڑک گئے اور فرمایا ان کی محبت ہے کہ ایسی حالت میں مجھ کو یاد رکھا۔

دیکھئے حضرت صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس قدر تو مشغول و مستغرق تھے مگر بارہ سال تک ایک وقت کی نماز وقت سے ٹلی نہیں (۱)۔ عوام الناس اہل کمال کو کیا جانیں وہ تو بھنگڑوں کو جانتے ہیں جو نماز بھی نہ پڑھیں۔ استغراق محمود وہ ہے (۲) جو سنت کے دائرہ سے خارج نہ ہونے دے۔ غرض انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان تھی اولیاء اللہ ایسے ایسے گزرے ہیں جن کا دین غالب تھا عشق پر اور ان کو استغراق میں بھی دین سے غفلت نہ ہوتی تھی۔

غم اور فکر

مگر چونکہ ہم خالی ہیں اس غم سے کیونکہ ہمارے اوپر دوسرا غم ضرر رساں مسلط ہو گیا ہے۔ (یعنی غم دنیا) اس لئے ہم کو دین کے کاموں میں حلاوت محسوس نہیں ہوتی باقی جن کو یہ غم حاصل ہے ان کی تو اس غم سے یہ حالت ہے۔

خوشا وقت شوریدگان غمش اگر ریش بینند دگر مرہمش (۳)

(۱) ایک وقت کی نماز بھی قضاء نہیں کی (۲) استغراق کی پسندیدہ حالت وہ ہے (۳) اس کے غم کے پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں تو اس پر مرہم رکھتے ہیں۔

گدایانے از پادشاہی نفور　　بہ امیدش اندر گدائی صبور(۱)
دما دم شراب الم در کشند　　وگر تلخ بینند دم در کشند(۲)

ان اشعار کی بندش بتلا رہی ہے کہ سچا مضمون ہے کیونکہ ان اشعار کا قلب پر اثر پڑتا ہے اور جمتا ہے جو بات دل سے نہیں ہوتی اس کا اثر اول تو ہوتا نہیں اگر عارضی طور پر ہو جاتا ہے تو باقی نہیں رہتا چنانچہ رنگین وعظ سن کر بعض لوگوں کو رونا آجاتا ہے، مگر مجلس سے اٹھے اور سب اثر جاتا رہا۔

غرض اہل غم کی یہ حالت ہے مگر ہمیں دین کا غم ہی نہیں اسی لئے اگر ہم تقویٰ بھی اختیار کرتے ہیں تو وہ بھی نام ہی کا ہوتا ہے ورنہ اس کی بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ کسی چیز سے ٹوٹتا ہی نہیں ہمارا تقویٰ کیا ہے؟ بی بی تمیزہ کا وضو ہے کہ فسق فجور(۳) سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا۔

چند لطائف

ایک بی بی تمیزہ تھی فاسقہ فاجرہ کسی بزرگ نے اس کو وضو کرایا، نماز پڑھوائی اور نصیحت کی کہ نماز پڑھتی رہنا ایک عرصہ کے بعد وہ بزرگ جو پھر ادھر آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ پابندی سے نماز بھی پڑھتی ہو؟ کہا جی ہاں! فرمایا: وضو بھی کرتی ہو؟ تو کہتی ہے کہ آپ جو وضو کرا گئے تھے میں اسی سے پڑھ لیتی ہوں۔

یہ حکایت تو کتابی ہے ایک حکایت مولانا رفیع الدین صاحب کی بیان کی ہوئی ہے کہ ایک سقہ کو وضو کرا دیا اور خیال کیا کہ یہ تو ہر وقت پانی میں رہتا ہے اس کو کیا مشکل ہے وضو کرنا۔ اس لئے کوئی خاص تاکید نہیں کی کچھ روز کے بعد دیکھا کہ وہ سقہ بے وضو نماز میں آکھڑا ہوا۔ اس سے پوچھا کہ یہ کیا، تو وہ کہتا ہے کہ جی اس دن وضو کرا نہیں دیا تھا۔

---

(۱) ایسے فقیر کی بادشاہ سے نفرت کرنے والے ہیں اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے ہیں (۲) ہر دم رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں (۳) گناہ اختیار کرنے سے بھی تقویٰ میں فرق نہیں پڑتا۔

وضوء کی خوبی

وضو پر ایک لطیف بات یاد آ گئی اللہ تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کو بتلائے ہیں کہ اگر نہ بھی بتلاتے تو ضرورت کی وجہ سے ان کو ویسے بھی دھوتے ہیں سو کوئی کام بڑھایا نہیں حق تعالیٰ کے احکام کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض طبیب کے پاس گیا اور کہا کہ گوشت کھانے کو طبیعت چاہتی ہے طبیب نے کہا کہ گوشت تو مضر ہوگا۔ مگر طبیب شفیق بھی ہے۔ اس نے کہا گوشت کھالینا مگر اس میں دھنیے کی پوٹلی ڈال لیا کرو ایسا طبیب کہاں ملے جو طبیعت کے موافق دوا اور غذا بتلائے حق تعالیٰ کی ہر تعلیم ایسی ہی ہے چنانچہ وضو میں وہی اعضاء دھونے کا حکم دیا جن کو ہم خود بھی دھوتے ہیں کیونکہ ان ہی پر گرد و غبار کا زیادہ اثر ہوتا ہے مگر اتنا بتلا دیا کہ اس ترتیب سے دھولیا کرو جو امور فطرت کے مناسب تھے وہی تجویز فرمائے بشرطیکہ فطرت سلیمہ ہو۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا میں اس کو کہہ رہا تھا کہ بعض کا تقویٰ ایسا ہوتا ہے جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں چاہے کچھ ہی کرلیں (ہنس کر فرمایا کہ) ہاں پیروں کے توڑنے سے نکاح تک ٹوٹ جاتا ہے۔

بناوٹی پیروں کا ڈھکوسلا

اس پر ایک پیر کی حکایت یاد آئی کسی مرید نے نکاح پڑھنے کے لئے ان کو نہ بلایا دوسرے کسی آدمی سے نکاح پڑھوالیا پیر نے سمجھا کہ یہ تو بری رسم نکلی اس سے تو بڑا نقصان ہوگا وہ اس کے گھر پہنچے اور کہا کہ بغیر ہمارے کس نے نکاح پڑھایا ہے بہت خفا ہوئے اور کہا کہ میں ابھی اس کو ادھیڑتا ہوں بس بیٹھ گئے پڑھنے والشمس والضحھا (قسم آفتاب کی اور اس کی روشنی کی) ادھیڑ بے نکاحا تمام آیتوں میں اسی طرح جوڑ لگاتے چلے گئے اور کہا ایک دو آیت اور ہی ہے بس ادھڑا ہی چاہتا ہے

اس بیچارے نے پانچ روپے نکال کر دے دئے اور کہا اجی ایسا مت کرو۔

صاحب دل کے کلام کا اثر

سو ہم جو اپنے تقویٰ طہارت کو ایسا سمجھتے ہیں کہ زوال کا خوف ہی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم کو وہ غم نہیں جس سے فکر ہو اسی غم کو ان اشعار میں بیان فرمایا ہے اور چونکہ صاحب مشاہدہ کا سچا مضمون ہے اس لئے موثر ہوتا ہے ان کا اثر دل پر پڑتا ہے غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں اثر نہیں ہوا کرتا ہے۔ عارف شیرازی کے کلام میں بھی اسی لئے بے حد اثر ہے کہ وہ صاحب مشاہدہ ہیں ان اشعار کو پھر دہراتا ہوں۔

خوشا وقت شوریدگان غمش اگر ریش بینند دگر مرہمش
گدایا نے از پادشاہی نفور بہ امیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم در کشند وگر تلخ بینند دم در کشند (۱)

محبت اور عمل

یعنی اہل اللہ اس غم میں بھی خوش رہتے ہیں یہ غم ایسی نعمت ہے کہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا اس لئے وہ اس نعمت پر مسرور ہیں یہ قید ایسی ہے کہ اس کا قیدی رہائی نہیں چاہتا۔

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند (۲)

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی معشوق عاشق کو اچانک پیچھے سے آکر بغل میں زور سے دبالے کہ ہڈی پسلی ٹوٹنے لگے۔ اول بے خبری سے ذرا گھبرایا اس گھبرانے کو دیکھ کر معشوق کہتا ہے کہ اگر تمہارا جی گھبراتا ہو، پریشانی ہو، تکلیف ہو تو چھوڑ دوں۔ تمہاری

(۱) اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا غم ہے خواہ اپنے زخموں پر نظر پڑے یا ان زخموں کے مرہم پر وہ لوگ تو ایسے فقیر ہیں جن کو بادشاہت سے نفرت ہے اور اسی کی امید میں گدائی پر صبر کئے ہوئے ہیں۔ دمادم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر تلخ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو جاتے ہیں (۲) اس کا قیدی قید سے چھٹکارا نہیں چاہتا اس کا شکار کمند سے خلاصی نہیں ڈھونڈتا۔

آزادی میں خلل پڑ گیا ہو تو چھوڑ دوں اگر عاشق صادق ہے تو جواب میں یہی کہے گا۔

اسیرت نخواہد رہائی زبند　　شکارت نجوید خلاص از کمند(۱)

اور یوں کہے گا کہ بھائی خدا نہ کرے کہ مجھ کو اس قید سے رہائی ہو۔ جس کو یہ قید نصیب ہوگئی ہے وہ اس سے نکلنا کب چاہے گا اسی طرح حضرت جب دین کا غم ہو جائے گا تو حقیقت کا ادراک ہوگا اس وقت اپنی کمی اعمال میں محسوس ہونے لگے گی۔ اور اس کمی کے احقاق سے بعض اوقات دل شکستگی اور مایوسی کی نوبت بھی آسکتی ہے ایسوں کی تسلی کے لئے فرمادیا گیا ہے المرء مع من احب (۲) یعنی اگر تم نے کوشش کی مگر پھر کمی رہ گئی تو غم مت کرنا، دل کو مت توڑنا پریشان مت ہونا تم ان ہی کے ساتھ ملحق ہو جاؤ گے جن سے تم کو محبت ہے۔ غرض المرء مع من احب ایسے شخص کی تسلی کے لئے فرمایا گیا ہے نہ کہ بے عملوں کے لئے۔

جیسے کوئی شخص کام میں کوشش کرے اور آقا کو معلوم ہو کہ اس نے پوری کوشش کی ہے اور اتفاق سے کام میں کچھ نقص رہ جاوے تو اجرت کے وقت اس کو پوری مزدوری دیتے ہیں اور انہی کام کرنے والوں کے ساتھ لاحق کرتے ہیں جن کے کام میں کوتاہی واقع نہیں ہوئی یہ معنی ہیں اس حدیث کے اور گو مفید خالی محبت بھی ہے یعنی اگر محبت بھی نہ ہوتی تو اس کے اعتبار سے یہ خالی محبت بھی مفید ہے مگر یہ تو نہیں کہ عمل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ نری محبت ہی محبت کافی ہو جاوے گو عمل کچھ بھی نہ ہو۔

قابل اعتبار محبت

اس کا ایک راز ہے وہ یہ کہ بدوں عمل کے جو محبت ہوتی ہے اس محبت میں بھی ثبات اور قوت نہیں ہوتی مثلاً ایک شیخ کے دو مرید ہوں ایک تو ہو متبع دوسرا غیر متبع تو متبع ہی کی محبت قابل اعتبار ہوگی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو اتباع کرتا ہے وہ

(۱) تیرا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اور تیرا شکار کمند سے چھٹکارا نہیں ڈھونڈتا (۲) الصحیح للبخاری ۸: ۴۸، ۴۹، الصحیح لمسلم کتاب البر والصلہ: ۱۶۵ سنن ابی داؤد: ۵۱۲۷، سنن الترمذی: ۲۳۸۶۔

شیخ کو پہچانتا ہے روز مرہ شیخ کے ساتھ اس کی معرفت بڑھتی ہے اور معرفت سے محبت بڑھتی ہے بخلاف اس شخص کے جو متبع نہیں وہ شیخ کو پہچانے گا ہی نہیں تو اسے محبت کیا خاک ہوگی اس کے نزدیک تو پیر اگر اس کی مرضی کے خلاف ہوا تو پیر ہی نہ رہے گا اور متبع شخص کی یہ حالت ہے کہ اگر پیر سے لغزش بھی ہو جاوے تو وہ موازنہ کرتا ہے اس لغزش کا اس کے کمالات کے ساتھ پھر کمالات کو غالب دیکھتا ہے تو بد اعتقاد نہیں ہوتا اور اس کی لغزش کو خیال میں بھی نہیں لاتا اور اس پر محمول کرتا ہے۔ ﴿ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ پس جن لوگوں کی ترازو کا پلڑا بھاری ہوگا وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس کو ایسا خیال کرتا ہے، جیسے کوئی حسین ہو مگر اس کے چہرے پر ایک کالا تل بھی ہو کہ وہ بھلا ہی نظر آتا ہے اس تل پر اہل عرب کا مذاق یاد آیا عرب کی عجیب تشبیہات تھیں۔ اشعار کہا کرتے تھے کہ اس کے چہرہ پر ایسا تل ہے جیسے میدان میں اونٹ کی مینگنی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلے یہ تہذیب تھی اہل عرب کی۔ ان کو تو اسلام ہی نے کام کی باتیں سکھلائیں بعد کے اشعار دیکھئے وہ کیسے اعلیٰ درجہ کے ہیں عرب کو اونٹ بہت محبوب تھے اسی واسطے ہر جگہ ان ہی کا تذکرہ تھا اس لئے محبوب کے تل کو بھی تشبیہ دی تو مینگنی سے اگر اسلامی شعراء کے یہاں یہ مضمون ہوتا تو اور عنوان سے ہوتا۔

عوام کے اعتقاد کا حال

غرض یہ ہے کہ جو پیر کے کمالات کو جانتا ہے تو وہ اس کی لغزش کو تل کی مثل سمجھے گا۔ اور جس کی نظر کمالات پر نہیں اس کے نزدیک معمولی لغزش بھی بلکہ غیر لغزش بھی پہاڑ کے برابر ہوگی۔

ایک شخص نے ایک بزرگ کی نسبت یہ کہا تھا کہ یہ کیسے بزرگ ہیں کہ

ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اسی طرح ہمارے یہاں ایک بی بی تھیں انہوں نے ایک بزرگ کو پاخانے جاتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں یہ کیسے بزرگ ہیں جو پاخانہ بھی کرتے ہیں۔ اسی بناء پر شریف عبداللہ نے بدوؤں کو اپنی ولایت کا مقصد بنانے کے لئے رکھا ہوا تھا اور یہ انتظام کیا تھا کہ وہ ان کے پاخانہ پیشاب کی اطلاع کسی کو نہ ہونے دیتے۔ جہلاء کا اعتقاد ہی کیا بس جاہل لوگ ان کی ولایت کے قائل تھے ان کا یہ خیال جم گیا تھا کہ شریف صاحب پاخانہ پیشاب نہیں کرتے اس لئے ولی ہیں۔

ایک شخص ایک معمولی بات پر میرے معتقد ہوئے تھے اور ایک معمولی بات پر غیر معتقد ہوگئے معتقد تو اس بات پر ہوئے تھے کہ میں نے ایک شخص سے تین روپے نہ لئے تھے جو مجھ کو ہدیۃً دینا چاہتے تھے بس اتنی بات پر معتقد ہوگئے اور کئی سال تک معتقد رہے اور غیر معتقد اس پر کہ ان کو دنیا کا ایک کام پیش آیا انہوں نے مجھ سے سفارش چاہی میں نے انکار کردیا۔ بس غیر معتقد ہوگئے کہنے لگے یہ کیسے بزرگ ہیں کہ ایک مسلمان کی سفارش نہیں کرتے۔

نادان کی دوستی

بس نادان کی دوستی ایسی ہی ہوتی ہے۔ الف لیلیٰ میں ایک حکایت جاہل کی دوستی کی لکھی ہے کہ ایک شخص قاضی کی لڑکی پر عاشق تھا اور وہ بھی اس کو بلاتی تھی مگر موقع نہ ملتا تھا۔ جمعہ کا دن آیا تو اس نے خیال کیا کہ آج اچھا موقع ہے سب لوگ نماز کے لئے چلے جائیں گے میدان خالی ہوگا اس سے کہلا بھیجا، مگر اس نے خیال کیا کہ محبوبہ کے پاس اچھی ہیئت سے جانا چاہیے چنانچہ ایک حجام کو بلا کر خط بنوانے کا ارادہ کیا وہ نائی اس قدر بکی تھا[1] کہ ذرا سا خط بنالیا اور پھر بک مارنے لگا اور یہ شخص ادھورا خط چھوڑ کر اٹھ بھی نہیں سکتا حجام نجومی بھی تھا کبھی خط کو چھوڑ کر دھوپ

(۱) بولتا بہت تھا۔

میں جا کھڑا ہوا کبھی اسطرلاب نکال کر ارتفاع شمس (۱) کو دیکھتا غرض اس نائی نے ایسے قصے پھیلا دیئے کہ جمعہ کا وقت بھی گزرنے لگا یہ شخص اس سے پیچھا چھڑا کر معشوقہ کے مکان میں گیا، نائی صاحب بھی خیر خواہی سے جا کر مکان کے باہر ایک تخت پڑا تھا اس پر بیٹھ گئے۔ جب قاضی صاحب جمعہ سے واپس ہو کر مکان پر آئے گھر میں جا کر کسی غلام پر خفا ہو کر اس کو مارنے لگے، وہ رونے چلانے لگا حجام صاحب سمجھے شاید میرے میاں پکڑے گئے اور پٹ رہے ہیں فوراً مدد کے لئے پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ اپنی بیٹی کو نہیں، کہتا اسی نے تو میرے آقا کو بلایا ہے۔ غرض راز فاش ہو گیا وہ آقا ڈرا کہ اب پکڑا جاؤں گا، بے چارہ اندر مکان کے اس حال کو معلوم کر کے کہیں کو چھپ کر بھاگا اور چھت پر سے کودا۔ پاؤں ٹوٹ گیا۔ جانے کس طرح پیچھا چھڑا کر وہاں سے بچا۔ نادان کی دوستی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک رئیس کے ہاں ایک ریچھ پلا ہوا تھا جب وہ رئیس سوتا تو یہ ریچھ اس کی مکھیاں جھلا کرتا ایک روز اتفاق سے مکھیوں نے بہت زور باندھا ریچھ اڑاتے اڑاتے دق ہو گیا اس نے دل میں کہا کہ اچھا میں تمہارا علاج بناؤں گا جب مکھیاں اچھی طرح آقا کے منہ پر بیٹھ گئیں اس نے بڑا سا پتھر لا کر ان مکھیوں کو مارا، مارا تو تھا مکھیوں کے وہاں آقا صاحب ہی کا سر چکنا چور ہو گیا۔ غرض نادان کی دوستی ہی کیا بلکہ مضر اور ایذا دہ ہے۔

اسی لئے حضرت مولانا گنگوہی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میرے ایک مرید کو ہٹا دے تو فی مرید ایک آنہ اور مولوی کے ہٹانے پر فی مولوی چار آنہ لے لے۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص نادان ہے اس کو شیخ سے بھی برائے نام ہی محبت ہوگی، نادان کی دوستی رہ نہیں سکتی وہ معمولی بات کو بھی بزرگی کے خلاف سمجھے گا اور غیر معتقد ہو جائے گا اس کی نظر جہل کے سبب اکثر عیوب ہی کی طرف زیادہ ہوگی (۲)

(۱) کبھی آلہ نکال کر سورج کی بلندی کا اندازہ کرتا (۲) اسکو اپنی جہالت کی وجہ سے زیادہ تر شیخ میں عیب ہی نظر آئیں گے۔

اور کمالات کو تو وہ جانتا ہی نہیں ان پر تو اس کی نظر کیا ہوتی۔

اتباع سبب ہے سچی محبت کا

سچی محبت اسی کو ہوگی جس کو شیخ کی معرفت ہوگی اور شیخ کی معرفت اس کے اتباع سے ہوگی جیسا اوپر قریب ہی مذکور ہوا پس من احب پورے طور پر وہیں صادق آئے گا جہاں اتباع ہو اور جہاں اتباع نہ ہوگا، محبت بھی کامل نہ ہوگی۔ اسی درجہ کے لئے عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں۔

تعصی الالٰہ وانت تظھر حبہ ھٰذا لعمری فی الفعال بدیع (۱)

لو کان حبك صادقًا لا طعتہ ان المحب لمن یحب یطیع (۲)

احکام و آثار

مگر اس وقت محبین بہت ہی کم ہوگئے ہیں جو متبع ہوں۔ ہاں محبت کا دم بھرنے والے بہت ہیں ان کی مثال وہی ہے جیسے ایک بدوی کو کسی نے دیکھا کہ زار زار رو رہا ہے اور ایک کتا اس کے پاس پڑا ہے اس نے رونے کا سبب پوچھا تو کہا میرا کتا مارے بھوک کے جاں بلب ہے اس کے فراق میں رو رہا ہوں، اس شخص کی نظر ایک تھیلے پر پڑی جس میں روٹی کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے اس نے بدوی سے کہا کہ اس تھیلے میں کیا ہے کہا روٹی کے ٹکڑے ہیں کہا پھر اس کو کھلاتا کیوں نہیں۔ کہنے لگا۔

گفت ناید بے درم در راہ نان لیک ہست آب دو دیدہ رائیگاں (۳)

یعنی اتنی محبت نہیں کہ روٹی خرچ کروں اور آنسو تو مفت کے ہی چار آنسو کی جگہ دس بہادوں گا اور روٹی کو لگے ہیں دام۔ بس محبت رونے کی ہے کھلانے پلانے کی نہیں ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور اسکی محبت کا دعویٰ کرتا ہے اپنی جان کی قسم یہ فعلوں میں انوکھی بات ہے (۲) اگر اس کی محبت میں صدق ہوتا تو اس کی فرمانبرداری کرتا اس لئے محبت کرنے والا محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے (۳) روٹی تو بغیر پیسوں کے راستہ میں نہیں ملتی لیکن آنسو تو مفت کے ہیں۔

قابل اعتبار محبت

غرض یہ ہے کہ غیر متبع کو محبت نہیں ہوتی یعنی کامل، اور یہ قاعدہ ہے کہ قابل اعتبار وہی چیز ہوتی ہے جو معتد بہ درجہ میں ہو جیسے رائی کا دانہ ترازو میں رکھا جائے، تو اس کا وزن تو ضرور ہوتا ہے، اگر ایک دانہ میں وزن نہیں تو ویسے ہی دانے بہت سے ڈال کر ترازو کا پلہ کیسے جھک گیا یہ تو سب کو مسلم ہے کہ ایک دانہ میں وزن ضرور ہے مگر چونکہ اس پر آثار مرتب نہیں ہوتے اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ نہ شریعت نے اعتبار کیا ہے نہ اہل عرف نے، گو فلاسفہ کے نزدیک یہ بات مانی ہوئی ہے کہ جب چیونٹی زمین پر چلتی ہے تو ساری زمین کو حرکت ہو جاتی ہے اور دلیل سے یہ بات سچی ہے مگر سننے والوں کو تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس پر احکام وآثار مرتب نہیں دیکھے جاتے۔ اس لئے قابل اعتبار نہیں سمجھا اسی طرح احکام شرعیہ وحسیہ میں وہی چیز معتبر ہوگی جس پر احکام وآثار مرتب ہوں پس محبت وہی معتبر ہوگی جس پر آثار مرتب ہوں (یعنی جس میں اتباع ہو وہی محبت قابل اعتبار ہوگی) نرا ''احب'' کچھ بھی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ لوگوں نے اپنے مطلب کی حدیث یاد کر لی ہے اپنے کو عمل سے فارغ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کلمة الحق ارید بها الباطل ہے یعنی المرء مع من احب بالکل حق ہے مگر اس سے اپنے مطلب کے لئے باطل مراد لیا گیا ہے جس کو خدا تعالیٰ نے بھی رد کیا ہے۔

غزوہ احد

چنانچہ غزوہ احد کے متعلق فرماتے ہیں: ﴿ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ

عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾(۱)

یہ حاصل ہے مدلول آیات کا غزوہ احد میں اول غلبہ مسلمانوں کو تھا اور آثار فتح کے نظر آتے تھے اس کے بعد مسلمانوں سے بے حکمی ہوئی اور شکست ہوئی اس میں بہت سے شہید ہوگئے اور جو میدان میں باقی رہے ان پر اونگھ آئی اور اس کے بعد سب رعب ودہشت جاتی رہی سب نے حضور ﷺ کے پاس جمع ہوکر پھر لڑائی قائم کی جو لوگ اس میں ضعیف الایمان تھے انہوں نے کہا ھل لنا من الامر من شیء ظاہر معنی تو اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار ہے اور یہ معنی نہایت اچھے ہیں مگر ان کی نیت میں یہ نہ تھا۔ بلکہ نیت میں یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے مشورہ پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے۔ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کرتے تو کیوں مارے جاتے۔ حق تعالیٰ نے انکار فرمایا فرماتے ہیں: ﴿يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ﴾ کہ دل کی بات آپ سے ظاہر نہیں کرتے ان کے دلوں میں تو یہ ہے ﴿لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو یہ نوبت کیوں آتی آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم گھروں میں بھی ہوتے تو بھی موقع پر آکر مارے جاتے بچ

(۱) پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین بھیجی یعنی اونگھ کہ تم میں سے ایک جماعت پر تو اس کا غلبہ ہورہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی۔ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلاف واقع خیالات کررہے تھے جو کہ محض حماقت کا خیال تھا وہ یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے۔ آپ فرمادیجیے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا ہے وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں کہا گر ہمارا کچھ اختیار چلتا تو ہم یہاں مقتول نہ ہوتے فرمادیجیے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لیے قتل مقدر ہوچکا تھا وہ لوگ ان مقامات کی طرف نکل پڑتے جہاں وہ گرے ہیں اور یہ جو کچھ ہوا اس لیے ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات کی آزمائش کرے اور تا کہ تمہارے دلوں کی بات کو صاف کردے اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں۔ (سورۃ آلِ عمران:۱۵۴)۔

نہیں سکتے یہ تمہارا غلط خیال ہے۔ اس آیت میں یہ جو کلمہ ہے ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ یہ کلمہ تو حق ہے (جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں اللہ نے جو چاہا سو کیا) مگر انہوں نے اس سے باطل مراد لیا کیونکہ ان کی نیت میں دوسری بات تھی کیونکہ ان کی مراد یہ تھی کہ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰھُنَا پس یہ قول ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ (کیا کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں) منافقین کا ہے اور وہ علی الاطلاق کفر کی بات نہیں کہہ سکتے تھے ذو وجہین (۱) بات کہہ سکتے تھے چنانچہ یہ بات انہوں نے ذو وجہین کہی۔

اس کا ایک محل تو حق ہے وہ محل حق یہ ہے کہ وہ اعتقاد قدر ظاہر کر رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو اس نے چاہا وہ کیا ظاہر تو یہ کر رہے ہیں مگر ان کے دل میں یہ تھا کہ اگر ہمیں اختیار ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ پس وہ ظاہر تو کچھ کر رہے تھے اور دل میں ان کے کچھ اور تھا سامنے تو اعتقاد حق ظاہر کیا جو اسلام کے موافق ہے اور دل میں یہ کہ اگر یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا، یعنی اگر ہمیں اختیار ہوتا تو مارے نہ جاتے یہ اعتقاد اسباب کے موثر ہونے کا ہے اور یہی ان کا عقیدہ تھا کہ اسباب موثر بالذات ہیں پس اسی پر ﴿یُخْفُوْنَ فِیْ اَنْفُسِھِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَکَ﴾ اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تم سے ظاہر نہیں کرتے۔ مرتب ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں میں تو کچھ ہے اور ظاہر کچھ کر رہے ہیں آگے اس کو بیان فرماتے ہیں ﴿یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰھُنَا﴾ کہتے ہیں کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں۔ کہ ان کے دلوں میں یہ ہے کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو ہم مارے نہ جاتے آگے اس کا رد ہے ﴿قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ الخ﴾ کہہ دیجئے اگر تم گھروں میں بھی ہوتے... الخ۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارا خیال باطل ہے تم کہیں بھی ہوتے جن کے لئے قتل

(۱) دو مطلبوں والی بات۔

لکھا گیا تھا تو وہ یہیں آ کر قتل ہوتے جا نہیں سکتے تھے۔ غرض اس آیت سے ان کی تائید ہوگئی کہ سچی بات سے جھوٹی بات مراد لینا کس قدر برا ہے یہی حال ہے اس شخص کا جو المرء مع من احب(۱) سے غرض باطل یعنی عدم ضرورت عمل پر تمسک کرتا ہے۔

داخلہ جنت کی خوش فہمی

اس حدیث کی طرح ہم نے اور چند حدیثیں بھی یاد کر رکھی ہیں۔ جیسے من قال لا الٰہ الااللّٰہ دخل الجنة(۲) جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا، جنت میں داخل ہوگیا۔

اس سے اپنے نفس کے موافق یہ مراد لے لی ہے کہ بس یہی کافی ہے۔ نہ کسی عمل کی ضرورت ہے نہ کسی گناہ سے بچنے کی حاجت۔ جو جی چاہے کرتے پھرو بس لا الٰہ الا اللہ کہہ لو سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے یہ بھی وہی کلمة الحق اريد بها الباطل (یہ کلمہ تو حق ہے مگر اس سے مراد باطل لی گئی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ہم نے جو اس حدیث میں کہا ہے خود اسی حدیث ہی میں آگے مصرع ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: وان زنیٰ وان سرق یعنی اگرچہ وہ زنا کرے، اور چوری کرے۔

تب بھی جنت میں داخل ہوگا اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعد لا الٰہ الا اللہ کہہ لینے کے کچھ بھی کرتا پھرے کچھ مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اعمال مامور بہا (جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے) کے بجالانے اور معاصی سے بچنے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ زنا و سرقہ سے ایمان نہیں جاتا۔ اس ایمان کی برکت سے کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔ گو بعد سزا سہی، تو اعمال کی عدم ضرورت اس سے کیسے

(۱) الصحیح للبخاری: ۸/۴۸، ۴۹، الصحیح لسملم کتاب البروالصل: ۱۶۵، سنن ابی داؤد: ۵۱۲۷، سنن الترمذی: ۲۳۸۶ (۲) المعجم الکبیر للطبرانی: ۷/۵۵، مجمع الزوائد للهیثمی: ۱/۱۸، المستدرك للحاكم: ۴/۲۵۱۔

ثابت ہوئی جیسے جہلاء کا زعم ہے(۱) کہ جو جی چاہے کرتا پھرے کچھ بھی حرج نہیں اور موٹی بات ہے کہ اگر صرف لا الٰہ الا اللہ کافی ہوتا اور کسی عمل کے کرنے یا گناہوں کے چھوڑنے کی ضرورت نہ ہوتی تو حضور ﷺ کیوں اعمال کی تاکید فرماتے اور گناہوں پر وعیدیں کیوں ارشاد فرماتے۔ یہ تو بہت آسان بات تھی اسی کی تعلیم فرمادیتے۔ نیز جب آپ ہی سے اعمال ساقط نہ ہوئے تو اور کسی سے کیسے ساقط ہوسکتے ہیں۔ دیکھئے آخر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کوئی بھی سمجھ دار تھے یا نعوذ باللہ سارے ناواقف ہی تھے۔ کیا صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور اعمال نہیں کرتے تھے۔ کیا صرف لا الٰہ الا اللہ پر بس کرتے تھے(۲) ان کے واقعات دیکھ لیجئے دین پر ان کو کیسی توجہ تھی۔ مستحب تک کو چھوڑنا بہت برا خیال کرتے تھے معلوم ہوا کہ یہ صرف تمہارا مذاق ہے(۳) ان دلائل کا یہ مفہوم نہیں صرف نفس کو اعمال کی مشقت سے بچانے کے لئے تم نے حیلے تراش لئے ہیں۔ کیا آیت ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ﴾ اس کی مثل عمل کرنے والوں کو چاہیے کہ عمل کریں۔

اور حدیث من ترك الصلوٰة متعمداً فقد كفر (۴) جس نے نماز کو قصداً چھوڑ دیا وہ کافر ہوگیا۔ وغیرہ یہ نصوص نہیں ہیں کیا آپ کو صرف ایک ہی نص ملی مجھے تو شرم آتی ہے ایسی ظاہر بات کی تفصیل کرتے ہوئے غرض یہ بات ﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ الخ﴾ (ایسے بندے ہیں جن کو تجارت نہیں غافل کرتی) جس کی اس وقت تفصیل کی گئی ہے ان ہی اعمال کو بتلا رہی ہے جن کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے۔

دین و دنیا کا تعلق

اب وہ صفات سنئے کیا ہیں بعضے ایک اور جہالت میں گرفتار ہیں کہتے ہیں

(۱) جاہلوں کا خیال ہے (۲) لا الٰہ الا اللہ پر اکتفاء کرتے تھے (۳) تمہارا خیال ہے (۴) كنز العمال: ۵۰۰۸، ۱۸۸۷۶ : اتحاف السادة المتقين : ۳/۱۰۔

کہ ہم تو ذات کے عاشق ہیں ہمیں جنت و دوزخ سے کچھ سروکار نہیں۔ اس لئے ہمیں عمل کی کیا ضرورت ہے عمل تو وہ کرے جو جنت کو لینا چاہے ہمیں اس سے مطلب ہی نہیں ہم تو ذات کے عاشق ہیں خوب سمجھ لیجئے کہ ذات کے عاشق کو زیادہ عمل کرنا چاہئے جنت تو تھوڑے عمل میں مل جاتی ہے ذات کی طلب میں تو بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس لئے حق تعالیٰ کے قرب کے لئے اور زیادہ عمل کی ضرورت ہے اب ان اعمال کو سنیئے ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ﴾ ان کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

اپنے اچھے بندوں کی ایک صفت یہ ارشاد فرمائی کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو غافل نہیں کرتی تجارت اور بیع ذکر اللہ سے۔ اس صفت کا حاصل ایک غلطی کا رفع ہے اور اسی غلطی کی وجہ سے لوگوں میں عمل کی ہمت نہیں رہی۔ آج کل کے غیر محقق واعظین نے عقل کو کھو رکھا ہے ایسی ایسی حکایات لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی ہمت باقی نہیں رہتی اور غلطی یہ ہوئی کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے جاتا رہتا ہے اس لئے وہ دین کا کام نہیں کرتے۔

تو خوب سمجھ لیجئے کہ دین کا کام کرنے سے آدمی دنیا سے نہیں جاتا بلکہ جس وقت آدمی کو دین کا شوق ہوتا ہے تو ضروری دنیا تو اور زیادہ آسانی سے ملتی ہے۔ البتہ فضول دنیا خود رخصت ہونا شروع ہوجاتی ہے جیسے چراغ کے جلنے سے تاریکی جاتی رہتی ہے جب چراغ آیا تو اندھیرا کہاں۔ باقی ضروری دنیا میں تو اور زیادہ برکت نصیب ہوتی ہے۔ تو ضروری اور مفید دنیا دین کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے۔ پس بہت لوگ جو کہتے ہیں کہ دنیا کے تعلقات جب سب ختم ہوجائیں۔ تب دین اختیار کریں، یہ خیال محض غلط ہے، البتہ دین میں یہ ضروری ہے کہ کمال حاصل ہونے پر غیر اللہ یعنی جو دنیا مضر ہے وہ خود رخصت ہوجاتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھو

کہ دین پر چلنے سے بیٹا مرجائے گا بہن مرجائے گی مال ودولت جاتا رہے گا۔ سو دنیا کی دولت رخصت نہیں ہوتی۔ البتہ ان چیزوں کے مضر(۱) تعلقات رخصت ہوجاتے ہیں، یعنی بیٹے کے ساتھ جو تعلق اب ہے محبت کا جو حاجب عن اللہ(۲) ہے وہ نہیں رہتا جو تعلق بیٹے کے ساتھ اب ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوجائے گا۔ سب چیزیں فنا ہوتی ہیں مگر فنا کے وہ معنی نہیں جو عوام کے نزدیک ہیں کہ آدمی کو کہیں کی بھی خبر نہ رہے نہ کھانے کی نہ پینے کی نہ اپنے تن کی۔ سو یہ معنی نہیں۔ فن کی کتابیں دیکھئے تو معلوم ہو بعض پڑھے لکھے لوگ بھی کتابیں پڑھتے ہیں مگر تدبیر نہیں کرتے۔

فنا کا حاصل ہے فضول تعلقات کا جاتا رہنا یعنی دنیا کی چیزوں سے جو تعلق اب ہے وہ نہیں رہتا بلکہ وہ تعلق خدا کے ساتھ ہوجاتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ یہ چیزیں کسی درجہ میں محبوب بھی نہ رہیں ان سے بالکل ہی بے تعلقی ہوجائے ان سے کوئی واسطہ ہی نہ رہے یہ نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی محبت مغلوب ہوجاتی ہے اور اس میں کوئی ضرر نہیں کہ ان چیزوں کے ساتھ بھی محبت کا تعلق ہو مگر غالب تعلق اللہ کے ساتھ ہو چنانچہ حق تعالیٰ ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں: ﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾(۳)

(۱) نقصان دہ (۲) بیٹے کی محبت جو تعلق مع اللہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے (۳) آپ کہہ دیجئے کہ اگر باپ تمہارے اور بیٹے تمہارے اور بھائی تمہارے اور بیبیاں تمہاری اور کنبہ تمہارا اور وہ مال جو کمائے ہیں تم نے اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور گھر جن کو تم پسند کرتے ہو اگر یہ چیزیں تم کو زیادہ پیاری ہوں اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اسکی راہ میں جہاد کرنے سے پس انتظار کرو یہاں تک کہ لاوے اللہ اپنا حکم۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ یہ صورت تو بری ہے کہ یہ چیزیں احب ہوں یعنی زیادہ محبوب ہوں اللہ سے معلوم ہوا کہ اگر کم محبوب ہوں تو مضائقہ نہیں آیت میں زیادہ محبوب ہونے کی مذمت کی گئی ہے یعنی یہ چیزیں زیادہ محبوب نہ ہونی چاہئیں۔

شبہ کا جواب

باقی اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس میں تو مساوات کی نفی بھی نہیں کی گئی، کہ یہ چیزیں محبت میں مساوی بھی نہ ہوں تو اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مساوات میں مضائقہ نہیں۔ حالانکہ یہ بھی خلاف ہے مساوات بھی نہ ہونا چاہیے وہ بھی ایسی ہی بری ہے جیسے زیادہ احب ہونا برا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احتمال ہی نہیں، اس لئے مساوات سے بحث ہی نہیں کی کیونکہ برابری ہو ہی نہیں سکتی یہ مشاہدہ ہے اور جو چیز واقع نہیں ہوتی اس سے بحث نہیں ہوتی وہ تو خود ہی خارج ہے پس بہت لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہوگی تو یہ چیزیں چھٹ جائیں گی۔ سو یہ بات نہیں، یہ چیزیں چھوٹیں گی نہیں البتہ خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے سے ان چیزوں کی محبت کم ہوجاتی ہے جو خود مفید ہے کیونکہ محبت کم ہونے سے پریشانی کم ہوجائے گی کیونکہ پریشانی کی حقیقت ہے کسی متوقع چیز کا چھوٹ جانا اور جب محبت کم ہوگی، اس کی طرف التفات بھی نہ ہوگا، تو اس کی تمنا اور توقع بھی نہ ہوگی جب توقع ہی نہ ہوگی تو پریشانی کیسی بلکہ وہ چیز ہو تب، اور نہ ہو تب، دونوں حالتیں برابر ہوں گی۔ جیسے کسی کو اولاد کی تمنا ہو تو اس کو نہ ہونے سے پریشانی ہوگی اور جو تمنا ہی نہ ہو تو کیا پریشانی ہوگی اہل اللہ کو کسی چیز کے جاتے رہنے سے اسی لئے پریشانی نہیں ہوتی کہ ان کو کسی چیز کی تمنا ہی نہیں ہوتی۔

اہل اللہ کی حالت

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ ان کے پاس کسی امیر نے ایک بیش قیمت موتی ہدیتاً بھیجا خادم نے پیش کیا فرمایا الحمدللہ! اور حکم دیا کہ اس کو رکھ لو۔ خادم نے رکھ لیا اتفاق سے وہ موتی چوری ہوگیا خادم نے یہ واقعہ بھی عرض کیا ان بزرگ نے فرمایا، الحمدللہ! خادم کو بڑا تعجب ہوا اس نے دوسرے وقت پوچھا کہ حضرت مجھے بڑی حیرت ہے وہ یہ کہ جب موتی حضور (۱) میں آیا تھا تو اس وقت بھی آپ نے الحمدللہ فرمایا تھا اور ضائع ہونے کی خبر معلوم ہوکر بھی یہی الحمدللہ فرمایا اس میں راز کیا ہے؟ آنا ور جانا دونوں پر کیسے خوشی ہوسکتی ہے فرمایا میں نے آنے پر الحمدللہ کہا، نہ جانے پر، بلکہ جس وقت آیا تھا میں نے قلب کو دیکھا کہ آنے پر کچھ خوشی نہیں ہوئی اس پر میں نے الحمدللہ کہا تھا، اسی طرح جاتے رہنے پر میں نے قلب پر کچھ رنج نہیں پایا اس لئے میں نے الحمدللہ کہا۔ یہ حالت ہے اہل اللہ کی۔

اسی طرح ایک اور قصہ ہے کہ کسی امیر نے ایک بزرگ کی خدمت میں ایک چینی آئینہ بہت قیمتی ہدیتاً بھیجا تھا وہ بزرگ کبھی کبھی اس میں اپنا منہ دیکھا کرتے تھے۔ اتفاقاً وہ آئینہ خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اس کو بڑا ہی ڈر ہوا کہ دیکھئے کیا ہوگا کیسا جلال آئے گا۔ (اس نے بزرگ کے عتاب سے بچنے کی ایک تدبیر کی جو صفحہ ۳۴ پر مذکور ہے) (خلیل)

اسمائے الٰہی کے جلالی و جمالی ہونے کی حقیقت

جلال پر ایک مضمون یاد آیا۔ وہ یہ کہ خدا کے اسماء کو لوگ جلالی اور جمالی کہتے ہیں یہاں تک تو صحیح ہے واقعی اسمائے باری تعالیٰ بعض جلالی ہیں اور بعض

(۱) آپ کی خدمت میں آیا۔

جمالی مگر لوگوں نے جو ان سے مراد لے رکھی ہے وہ غلط ہے لوگوں کے نزدیک جلالی ان اسماء کو کہتے ہیں جن کے پڑھنے سے وبال پڑے گرمی پیدا ہو۔ جنون پیدا ہوجائے اور جو اسماء ایسے نہ ہوں ان کو جمالی کہتے ہیں سو یہ تفسیر محض غلط ہے۔ کہیں خدا کے نام سے بھی وبال اور نحوست یا جنون پیدا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ! بلکہ جلالی وہ ہیں جن میں معنی قہر کے پائے جاتے ہیں جیسے قہار، جبار، عزیز اور جمالی وہ ہیں جن میں معنی لطف کے پائے جاتے ہیں جیسے رحمٰن، رحیم، کریم، لطیف سو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں دونوں صنعتیں ہیں۔

اسی معنی کے اعتبار سے بعضے بزرگوں کو بھی لوگ جلالی کہتے ہیں کہ ان کو غصہ بہت آتا ہے۔ سو یہ صحیح ہے کہ بزرگوں کو غصہ آتا ہے مگر اس میں مصالح ہوتے ہیں پس ان کا جلال بھی مشتمل بر جمال ہوتا ہے۔ جیسا حق تعالیٰ کے قہر کے ساتھ بھی لطف ملا ہوا ہوتا ہے۔

غضب الٰہی میں پوشیدہ رحمت

اس لطف پر ایک آیت یاد آئی حق تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ ﴾(۱) اگر میاں لوگوں سے ان کے گناہوں پر مواخذہ فرماتے تو زمین پر جتنے چلنے والے ہیں سب کو ہلاک کر ڈالتے۔

بظاہر یہاں مقدم اور تالی میں ملازمت کا تعلق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ مواخذہ تو ہو آدمیوں سے اور ہلاک ہو دواب (۲) بھی۔ اگر یوں فرماتے تو ملازمت کا تعلق ہوتا۔

ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من الناس اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے گناہوں کی وجہ سے مواخذہ فرماتے تو زمین پر کوئی آدمی نہ بچتا۔

(۱) سورۃ النحل: ۶۱ (۲) جانور۔

سو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمیوں کو ڈرا بھی رہے ہیں جو قہر وجلال ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کا شرف بھی بتلا رہے ہیں جو لطف و جمال ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ اگر انسان سے مواخذہ کیا جاتا تو سارے عالم کو اس لئے درہم برہم کر دیا جاتا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے انسان ہی کے واسطے ہے جب یہ نہ رہتا تو کچھ بھی نہ رہتا۔ سبحان اللہ! جن پر غصہ ہے ان کی شرافت ومقصودیت بھی ظاہر کی جارہی ہے۔ صاحبو! واقعی تم بڑے مرتبہ والے ہو مگر افسوس ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر تدبر نہیں کرتے اگر تدبر کرتے تو اللہ تعالیٰ کے غصہ میں بھی رحمت نظر آتی اور اس سے ہمارے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجاتی اسی طرح اہل اللہ بھی غصے ہوتے ہیں مگر ان کے غصہ کے اندر رحمت بھی ہوتی ہے واقعات کو دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ کتنی رعایتیں کرتے ہیں۔

اہل اللہ کے دنیاوی تعلقات کا حال

چنانچہ جن بزرگ کا واقعہ میں بیان کر رہا تھا کہ خادم کے ہاتھ سے ان کا آئینہ چینی ٹوٹ گیا جو موجب عتاب وعقاب ہوتا مگر اس میں بھی ان کی رحمت کا ظہور ہوا۔ وہ اس طرح کہ خادم کو جب عتاب کا ڈر ہوا تو اس نے سوچا کہ بزرگ زندہ دل ہوتے ہیں لاؤ شاعری بگھارو۔ خوش ہو کر کچھ نہ کہیں گے چنانچہ وہ حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

از قضائے آئینہ چینی شکست (چین کے آئینہ کی قضا آئی اور وہ ٹوٹ گیا)

آپ فی البدیہ فرماتے ہیں:

خوب شد اسباب خود بینی شکست (بہت اچھا ہوا کہ خود بینی کے اسباب ختم ہوگئے)

یعنی اس آئینہ کا بھی جھگڑا ہی تھا خود بینی کا سبب تھا اچھا ہوا ٹوٹ گیا۔ پاپ کٹا یہ[1] حالت ہوتی ہے اہل اللہ کے دنیوی تعلقات کی کہ ان کو کسی چیز کے نہ آنے سے فرحت

(۱) اچھا ہوا یہ روز روز منہ دیکھنے کا قصہ ہی ختم ہوا۔

ہو، نہ جانے سے غم۔ اسی انقطاع تعلق کو کہتے ہیں۔

تا بدانی ہر کہ را یزدان بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند(۱)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ زراعت تجارت بی بی بچے سب چھوٹ جاتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سے دل کو کوئی خاص لگاؤ اور تعلق نہیں رہتا بلکہ خاص لگاؤ اللہ تعالیٰ سے ہوجاتا ہے۔

مکہ میں کثرت سے ایسے دکاندار ہیں جن کی یہ حالت ہے کہ دکان پر سودا لئے بیٹھے ہیں اور دلائل الخیرات پڑھ رہے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کررہے ہیں ذکر میں مشغول ہیں۔ کوئی خریدار آیا سودا دے دیا پھر ذکر اللہ میں مشغول ہوگئے۔ اور یہ معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر جب بقدر ضرورت مل گیا دکان بند کی اور گھر کو، بلکہ اکثر حرم شریف کو چل دیئے بس اتنا تعلق ہے ان کو دنیا کی چیزوں سے۔

رزق حلال کا اثر

ایک شخص عبداللہ شاہ تھے دیوبند میں، جو گھاس بیچتے تھے جو ملتا تھا اس میں سے ایک حصہ اپنی والدہ کو دیتے اور ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے اور باقی اپنے خرچ میں لاتے۔ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا یعقوب صاحب اور دوسرے حضرات کی دعوت کی حضرت مولانا نے فرمایا کہ دعوت کہاں سے کروگے تمہارے پاس ہے ہی کیا کہنے لگے کہ جو حصہ خیرات کا نکالتا ہوں اسی سے دعوت کروں گا غرض پانچ آنے جمع کئے اور حضرت مولانا کے پاس لائے اور کہا کہ تم ہی پکالی جیو۔ میں کہاں جھگڑا کروں گا، اگر دنیا دار بھی اس طرز کو اختیار کرلیں تو کیسا اچھا ہو۔ مہمان تھے کئی اور پیسے کل پانچ آنے بزرگوں مہمانوں کا مشورہ ہوا کہ کوئی سستی

(۱) جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنالیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاروبار سے بیکار کردیتے ہیں: مثنوی: ۲۱۲۰

سی چیز تجویز کی جائے چنانچہ میٹھے چاول گڑ کے تجویز ہوئے۔ بڑی احتیاط سے پکائے گئے کوری ہانڈی منگائی گئی پکانے والے کو وضو کرایا گیا غرض ہر طرح کی احتیاط کی گئی، وہ چاول تھے ہی کتنے ایک ایک دو دو لقمے کھالئے مولانا خود فرماتے تھے کہ ان دو لقموں کی یہ برکت دیکھی کہ ایک ماہ تک قلب میں انوار و برکات محسوس ہوتے تھے۔ ایک ماہ کامل یہ اثر رہا، اور میں کہتا تھا کہ جس کی کمائی کے ایک لقمہ کا یہ اثر ہے تو جو دن رات اسی کو کھاتا ہے اس کی کیا حالت ہوگی۔

صاحبو! اگر اللہ ورسول ﷺ کی کامل محبت ہوگی تو یہ بات پیدا ہوجائے گی۔ پس اہل اللہ دنیا کو ضروری تو سمجھتے ہیں مگر "الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ" ان کا مشرب ہوتا ہے یعنی ضروری چیز بقدر ضرورت ہی اختیار کی جاتی ہے وہ حضرات بقدر ضرورت دنیا کو حاصل کرتے ہیں جیسے تم پاخانہ میں جاتے ہو تو کیا وہاں تفریح کے لئے جاتے ہو بلکہ ضرورت رفع کرنے کو، اور جہاں ضرورت رفع ہوگئی بس باہر نکل آئے اسی طرح ان کے نزدیک دنیا ایک حاجت کی چیز ہے تفریح کی چیز نہیں دل لگانے کی جگہ نہیں بس اللہ کی محبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں سے ضروری تعلق رہ جاتا ہے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

تا بدانی ہر کہ یزدان بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند(۱)

تعلق باللہ کا تعلق دنیا پر اثر

پس یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ کی محبت سے دنیا جاتی رہتی ہے تو اس کے معنی یہی ہیں کہ اس کو دنیا سے تعلق و محبت نہیں رہتی یہ معنی نہیں کہ وہ سارے حقوق کو معطل کر کے بیٹھ رہے۔ وہ کرتا سب کچھ ہے مگر دل اور ہی طرف رہتا ہے بس یہ

(۱) جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا بنا لیتے ہیں اس کو عام دنیا کے کاروبار سے بیکار کر دیتے ہیں: مثنوی: ۲۱۲۰

کیفیت ہوتی ہے کہ دل بیار دست بکار دنیا داروں کی طرح نہیں کہ ہر وقت دنیا ہی میں ان کا دل رہتا ہے۔

چنانچہ ایک شاعر تھے ان کو نماز میں بھی شعر ہی کی سوجھتی تھی جہاں کوئی مصرعہ موزوں ہوا نماز توڑ دیتے اور شعر لکھ لیتے ایسے ہی دنیاداروں کا مذاق ہے کہ اگر نماز کے وقت گاہک آ گیا تو یوں سمجھتے ہیں کہ اگر نماز جماعت سے پڑھی اور دیر لگ گئی تو گاہک بھاگ جائے گا۔ اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ نماز جماعت سے پڑھو یہ بڑی مشکل بات ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جانے کے بعد دنیا کی چیزوں سے ایسا تعلق نہ رہے گا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے باقی وہ کمانے میں تم سے اچھا رہے گا۔ ہمارے قریب گاؤں میں ایک شخص ہیں ایک گاؤں میں کھیتی کرتے ہیں اور کھیتی بھی عجیب طریقہ سے ایک بیل تو ان کے پاس ہے اور دوسرا بیل ضرورت کے وقت کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تیسرے چوتھے سال دس پانچ روپے کسی سے قرض بھی لے لیتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اتنا غلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ سال بھر کو کافی ہو جاتا ہے اور دین کی یہ حالت ہے کہ کام بھی کرتے ہیں اور ذکر میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ اطمینان ان کے اندر ایسا دیکھا کہ ایسا اطمینان ہونا مشکل ہے بیماری (انفلونزا) جو پھیلی تھی تو لوگوں کے دلوں کی کیا حالت تھی سب جانتے ہیں کہ کیسی پریشانی سب کو تھی۔ وہ اسی حالت میں میرے پاس آئے تھے خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ بھی ایک شان ہے اللہ کی کہ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا ہراس ان پر نہ تھا۔ ویسے وہ دیکھنے میں گنوار ہیں۔ کوئی پڑھے لکھے آدمی نہیں مگر فہم کی یہ حالت ہے کہ پڑھے لکھوں سے زیادہ فہیم ہیں(۱)۔

(۱) سمجھدار۔

دین اور فہم

دین سے فہم بھی درست ہوجاتا ہے۔ اسی درستی فہم پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک شخص گنوار حضرات مولانا گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خدمت میں آیا اور کہا کہ مولوی جی، مجھے مرید کرلو۔ حضرت نے فرمایا، اچھا بھائی آ۔ مرید کرتے ہوئے جو باتیں کہلواتے ہیں کہ نماز پڑھو، روزہ رکھا کرو، سب کچھ کہلوایا جب مولانا اپنی باتیں پوری فرما چکے تو آپ کہتے ہیں کہ مولوی جی تم نے افیم سے تو توبہ کرائی نہیں مولانا نے فرمایا کہ بھائی مجھے کیا خبر کہ تو افیم بھی کھاتا ہے حضرت چونکہ طبیب بھی تھے جانتے تھے کہ دفعۃً افیون کا چھوڑنا مشکل ہے اور طالب کی حالت کی رعایت ضروری ہے اس لئے آپ نے فرمایا کہ کتنی کھایا کرتے ہو۔ میرے ہاتھ پر رکھ دو۔ اس نے گولی بنا کر حضرت کے ہاتھ پر رکھ دی۔ حضرت نے اس میں سے کچھ کم کر کے باقی اس کو دے دی اور فرمایا کہ اتنی کھالیا کرو پھر مشورہ کرلینا۔ وہ شخص کچھ دیر خاموش بیٹھ کر کہنے لگا اجی مولوی جی جب توبہ ہی کرلی پھر اتنی اور اتنی کیا یہ کہہ کر افیون کی ڈبیہ نکال کر دیوار پر ماری اور یہ کہا کہ اری افیم جا میں نے تجھے چھوڑ دیا بس یہ کہہ کر چلا گیا نہ ذکر پوچھا نہ شغل۔

افیون کے چھوڑنے سے دست آنے لگے۔ اس نے کہلا کر بھیجا کہ مولوی جی دعا کردیجیو کہ میں اچھا ہوجاؤں مگر افیم نہ کھاؤں گا غرض بری حالت تک نوبت پہنچی مرتے مرتے بچا مگر اچھا ہوگیا تندرست ہوکر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے پوچھا کون؟ کہا میں افیم والا اور سارا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد دو روپیہ پیش کئے مولانا نے کس قدر عذر کے بعد دلجوئی کی اور روپے قبول فرمالئے تو آپ کہتے ہیں کہ اجی مولوی جی یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ یہ کیسے روپے ہیں۔

مولانا نے فرمایا کہ بھائی اب بتلادے کیسے روپے ہیں اس نے کہا کہ یہ روپے افیم کے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ افیم کے کیسے اس نے کہا میں دو روپے مہینہ کی افیم کھاتا تھا جب میں نے افیم سے توبہ کی تو نفس بڑا خوش ہوا کہ اب دو روپے ماہوار بچیں گے میں نے کہا کہ یہ تو دین میں دنیا مل گئی بس میں نے نفس سے کہا کہ یہ یاد رکھو کہ یہ روپیہ تیرے پاس نہ چھوڑوں گا۔ یہ مت سمجھ کہ تجھے دے دوں گا بلکہ اسی وقت نیت کرلی کہ جتنے کی افیم کھایا کرتا تھا وہ پیر کو دیا کروں گا پس یہ دو روپیہ ماہوار آپ کے پاس آیا کریں گے۔

دیکھا آپ نے یہ گنوار کی حکایت ہے جس کو پڑھنا لکھنا کچھ نہ آتا تھا مگر دین کی سمجھ ایسی تھی کہ دین میں دنیا کی آمیزش کو فوراً سمجھ گیا یہ وہ بات ہے کہ اچھے اچھے لوگوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ کامل بزرگوں سے ایسے واقعات منقول ہیں۔

حضرت شیخ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک جہاز میں بیس مٹکے شراب کے خلیفہ وقت کے واسطے آئے تھے آپ بھی دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے پہنچے جہاز والے سے پوچھا کہ اس میں کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ خلیفہ کے واسطے شراب آئی ہے آپ نے مٹکوں کو توڑنا شروع کیا انیس توڑ دیئے صرف ایک مٹکا باقی رہ گیا تھا کہ اس کو آپ نے چھوڑ دیا اس واقعہ کی خبر خلیفہ کو پہنچی خلیفہ کو غصہ آیا اور ان کے پکڑ لانے کا حکم ہوا حاضر کئے گئے۔ خلیفہ نے ایسی جرات کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا حق تعالیٰ کا حکم ہے ﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ﴾(۱) حکم کر کرنے کا اور روک برائی سے جو تکلیف تجھ کو پہنچے اس پر صبر کر۔

خلیفہ نے پوچھا کہ ایک کو کیوں چھوڑ دیا فرمایا کہ اس کے توڑنے میں نفس کی آمیزش ہوگئی تھی۔ اس لئے چھوڑ دیا وہ اس طرح کہ جب میں انیس مٹکے توڑ چکا

(۱) سورۃ لقمان: ۱۷۔

تو نفس کے اندر خیال ہوا کہ تو نے بڑا کام کیا کہ خلیفہ کی بھی پرواہ نہ کی اس بات پر نفس پھولا تو میں نے ایک کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ کام خالص اللہ کے واسطے نہ رہا تھا۔ خلیفہ پر اس اخلاص کا یہ اثر ہوا کہ ان کا معتقد ہوگیا اور محتسب شہر بنادیا اسی طرح نفس کی کید کی طرف اس گنوار کا فہم بھی پہنچا۔

یہ حکایت (گنوار کی) اس پر یاد آگئی تھی کہ میں نے کہا تھا کہ دین اختیار کرنے سے آدمی کا فہم بھی درست ہوجاتا ہے ایسے شخص کو وہ باتیں منکشف (۱) ہوتی ہیں جو علما کو بھی نہیں ہوتیں۔ یہ تو نعمت معنوی تھی باقی حسی نعمتیں بھی ایسے شخص کو اوروں سے زیادہ عطا ہوئی ہیں۔

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

چنانچہ سب نعمتوں کی روح اطمینان ہے اور اس شخص کو اطمینان (کہ اگر خالص دین کے ہوجاؤ گے تو اوروں سے اچھے رہو گے) ایسا میسر ہوتا ہے جو مال سے بھی کبھی حاصل نہیں ہوسکتا پھر ایک اور بات کہتا ہوں کہ دنیا کی چیزوں سے اگر تعلق کم ہوگیا تو ضرر کیا ہوا بلکہ تعلق کم ہونے سے تو اور قید سے رہائی ہوجائے گی۔ بہرحال یہ اثر ہے دین میں کہ دنیا کا فکر وغم کم ہوجائے گا یہ خود اس میں خاصیت ہے۔

باقی بعضوں کا یہ خیال ہی غلط خیال ہے کہ پہلے دنیا کے سب کام پورے کرلیں اس کے بعد دین حاصل کرلیں گے کیونکہ دنیا کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔

کارے دنیا کسے تمام نہ کرد (۲)

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ ساری عمر دنیا کے قصوں میں گزر جاتی ہے دین کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ بس کامیابی کی صورت ہے تو یہی ہے کہ دین کا کام شروع

(۱) وہ باتیں معلوم ہوجاتی ہیں (۲) دنیا کے کام کسی نے بھی پورے نہ کیے۔

کردو۔ یہ انتظار ہی مت کرو کہ پہلے دنیا کا کام تمام کرلیں پھر دین کا کام کریں گے دین کی روشنی پھیلنے سے فضول دنیا کی ظلمت خود ہی جاتی رہے گی اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس کی ہمت نہ ہو تو چلو یہ بھی نہ سہی بلکہ یوں کرو کہ دونوں کو ساتھ ساتھ شروع کردو۔ دنیا سے فارغ ہونے کا انتظار مت کرو۔ دین خود دنیا پر غالب آجاوے گا۔

دنیا کے ساتھ دین شروع کرنے کے متعلق بھی لوگ ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ طاعت وتجارت میں منافات ہے پھر دنیا کے ساتھ دین کیسے شروع کریں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ دکانداری نہ ہو تب طاعت ہوسکتی ہے دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔ حق تعالیٰ اس غلطی کو بھی رفع فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ یعنی تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی صفت بیان فرمارہے ہیں کہ ان کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں ڈالتی یوں نہیں فرمایا رجال لا یتجرون کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ تجارت نہیں کرتے۔ اگر دونوں میں منافات ہوتی تو یوں فرماتے: پس معلوم ہوا کہ دونوں میں منافات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت تو وہ لوگ کرتے ہیں مگر تجارت ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی ذکر اللہ بیع وتجارت کو چھوڑاتا نہیں البتہ غفلت سے روکتا ہے۔

بہرحال ایک غلطی تو یہ ہے کہ بعض لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ دنیا کو جب تک بالکل نہ چھوڑ دیں دین کو کیا اختیار کریں اور دنیا چھوڑنا مشکل، اس لئے وہ دین کو اختیار ہی نہیں کرتے حالانکہ دین دنیا کو چھوڑاتا نہیں، یہ غلطی تو ان لوگوں

کی ہے جو ہنوز دین کے طالب ہی نہیں ہوئے اس غلطی کا سبب وہی دین و دنیا میں تنافی کا اعتقاد(۱) ہے۔

ایک وہ لوگ ہیں جن کے قلب میں دین کی عظمت ہے اور بزعم خود اس کے طالب بھی ہیں، مگر ان کی یہ حالت ہے کہ جس کو فقیر سن لیا اس کی تعظیم کرنے لگے گو وہ تعظیم شرک ہی کیوں نہ ہو، اگرچہ منشاء اس تعظیم کا عظمت ہے دین کی، مگر اس عظمت میں غلو ہو گیا ہے، اس لئے وہ پیروں ہی کے ہو لئے اور بیوی بچوں سے بے تعلق ہو گئے، وہ سمجھتے ہیں کہ تجارت اور دین میں تنافی ہے اس لئے دنیا کو بالکل قطع کرتے ہیں، اس غلطی کا سبب بھی وہی دین و دنیا کا تنافی کا اعتقا ہے۔

ایک غلطی نئے تعلیم یافتوں کو ہوتی ہے کہ وہ خالص دین کے قصد کو ضروری نہیں سمجھتے، انہوں نے اصل اور مقصود بالذات دنیا ہی کو قرار دے رکھا ہے، اس کے تابع دین بھی سہی، دین کو دنیا کے ساتھ ایسا سمجھتے ہیں جیسا دوپٹہ میں پیمک (۲) اصل مقصود تو دنیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تھوڑا لگاؤ دین کا بھی سہی، دین کو متبوع نہیں سمجھتے جیسے کپڑا تو اصل ہے اور پیمک اس کے تابع، اسی طرح یہ لوگ دنیا کو اصل قرار دے دیتے ہیں کہ اگر وقت بچے تو خیر دین کا کام بھی کرلو، اگر نہ بچے تو مت کرو۔

مذہب کے بارے میں بے ہودہ خیالات

بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ مذہب صرف اس لئے ہے کہ دنیا کی ترقی کی جائے، بعض کو جنت و دوزخ سے بھی انکار ہے کہتے ہیں کہ صرف ڈرانے کی غرض سے جنت و دوزخ کا ذکر کیا گیا ہے، کوئی واقعی چیز نہیں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا

(۱) اس کا سبب یہ اعتقاد ہے کہ دین دنیا کے منافی ہے (۲) جیسے دوپٹہ میں بیل لگی ہوتی ہے۔

کہ غیر واقعی چیز سے جس کا غیر واقعی ہونا بھی بتلا دیا جائے کیسے تخویف ہوسکتی ہے، جب انسان کو یہ معلوم ہوجائے کہ جس چیز سے ڈرایا جارہا ہے اس کا وجود الفاظ ہی میں ہے واقع میں نہیں تو وہ اس سے کیا خاک ڈرے گا۔ پس یہ دعویٰ عقلاً بھی غلط ہوا کہ صرف ڈرانے کی غرض سے دوزخ کا ذکر کیا ہے، جب عقلاً یہ مصلحت محض باطل ہوئی تو یوں کہو کہ فضول ذکر کیا ہے، سو ایسا ایمان واسلام آپ ہی کو مبارک ہو جو خدا کی طرف لغو اور عبث کو منسوب کرے اور اگر فرض بھی کرو، نعوذ باللہ جنت ودوزخ واقعی کوئی چیز نہیں اور اللہ تعالیٰ نے محض بطور پالیسی کے ان کا ذکر کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ جب خدا نے ہم کو ڈرایا ہے تو یہ معلوم ہوگیا کہ اس کی غرض یہی ہے کہ لوگ جنت و دوزخ کا اعتقاد رکھیں، تو پھر اس کی کیا وجہ کہ خداوند تعالیٰ ایک پالیسی قائم رکھنا چاہتے ہیں اور آپ اس کو توڑنا چاہتے ہیں کیا آپ کے ذمہ یہ بات لازم نہیں کہ خدا کی پالیسی کی حفاظت کریں، نہ معلوم ان لوگوں کی عقل کہاں چلی گئی یا مسخ ہوگئی۔

علاوہ اس کے اگر جنت ودوزخ کا وجود نہیں تو ان سے ڈرانا ایسا ہوا جیسے ''ہوّ ئی''(۱) سے بچوں کو ڈرایا کرتے ہیں کہ اسکا وجود کچھ بھی نہیں ہوتا، تو گویا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ جھوٹ بولا، پھر اس کا بھی قائل ہونا پڑے گا کہ نیز اللہ تعالیٰ بے وقوفوں ہی کے ڈرانے کو ہیں۔ ان عاقلوں کے ڈرانے کو نہیں، کیونکہ ''ہوّ ئی'' سے تو بے وقوف ہی ڈرا کرتے ہیں، لندن کی ہوا کھانے والے خاک ڈریں گے سبحان اللہ! کیا عظمت کی ہے ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی، عنقریب معلوم ہوجائے گا آخرت میں، غرض ان لوگوں کے نزدیک اصل تو ہے دنیا باقی دین و مذہب وہ محض دنیا کی حفاظت کے لئے ہے۔

(۱) بچوں کو ہَوکر کے ڈراتے ہیں۔

مذہب کا اثر

اس طرح سے مشاہدہ ہے کہ مذہب کے برابر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا جب مذہب کی پابندی ہوگی تو فتنہ فساد نہ ہوگا کوئی کسی کا حق نہ مارے گا، چوری نہ کرے گا، آپس میں اتفاق قائم رہے گا، پس دنیا پرامن ہوگی، گویا مذہب ان کے نزدیک اس لئے بنایا گیا ہے کہ دنیا کی حفاظت رہے۔

صاحبو! اس سے تو سارا قرآن وحدیث ہی اڑا جاتا ہے، پھر چونکہ اصل مقصود ان کے نزدیک دنیا ہے اور اہل دین مقصود دین کو سمجھتے ہیں، اس لئے یہ لوگ دین والوں کو بے وقوف بھی سمجھتے ہیں اور اس اعتقاد کا ایک اثر یہ بھی ہے، کہ اپنوں سے بوجہ طالب دین ہونے کے غیر معتقد اور غیر قوموں کی بوجہ طالب دنیا ہونے کے مدح کرتے ہیں، ان لوگوں کا یہ مذاق ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں جو بات بھی ہے وہ تو ان کے نزدیک بری اور غیر قوموں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اچھی، ہمیشہ اپنے لوگوں کو برائی اور غیر قوموں کی مدح کرتے رہتے ہیں۔

ایک اثر یہ ہے کہ علما کی بات کو نہیں مانتے کیونکہ ان کو تو بیوقوف شمار کرتے ہیں، چنانچہ علما ہمیشہ سے کہتے آرہے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک جماعت خالص مذہبی ہونی چاہیے جو محض مذہب کی خدمت کرے، مگر یہ لوگ اس میں قیل وقال کرتے رہے، لیکن عجیب بات ہے کہ ان کی یہ ساری قیل وقال اسی وقت تک رہی جب تک کہ غیر اقوام نے اپنے اندر ایسی مذہبی جماعت پیدا نہیں کی تھی اور اب جو وہ ایسا کرنے لگے تو یہ بھی ان ہی کا دم بھرنے لگے کہ مذہبی جماعت ضرور ہونا چاہئے، چنانچہ غیر قوموں کی دیکھا دیکھی اب کسی قدر یہ بھی علما کے ہم زبان ہوگئے ہیں بس ان کا مشرب وہی ہوجاتا ہے جو غیر قوموں کا مشرب ہوجاوے حالانکہ

بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں قوموں سے کسی چیز کے لینے کی کچھ بھی حاجت نہیں ہمارے یہاں تو سب کچھ ہے مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پرنان ترا بر فرق سر تو ہمی خواھی لب نان در بدر(۱)

ہمارے یہاں تو جواہرات بھرے ہوئے ہیں اور یہ دوسروں سے کوڑیوں کے طالب ہیں، اسی طرح یہ لوگ تقلید کرتے ہیں غیر قوموں کی حالانکہ اپنے یہاں سب کچھ ہے۔

کورانہ تقلید

اور طرفہ یہ ہے (۲) کہ اس کورانہ تقلید میں پریشانی بھی اٹھاتے ہیں۔ اس پر ایک حکایت یاد آئی، ایک اوچھے صاحب تھے۔ جنٹلمین، گھر کے غریب تھے اس لئے کوٹ پتلون بھی صرف سوتی گبروں کا تھا جس میں ذرا گرامی نہ تھی جاڑے کا موسم، ریل میں سفر کررہے تھے اور جنٹلمینی لباس پہنے ہوئے تھے کان بھی کھلے ہوئے سر بھی کھلا ہوا ایک انگریز نے لیمن پانی اور برف پیا آپ نے بھی تقلید میں برف پیا بس اینٹھ گئے ایک اور صاحب جو مجھ سے اس حکایت کو بیان کرتے تھے اس درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے پاس رضائی تھی ان کو صاحب بہادر کے حال پر رحم آیا انہوں نے کہا کہ رضائی لیتے ہو کچھ انکار نہ کیا چپکے سے لے لی سب اینٹھ مروڑ نکل گئی خدا کے بندے کو اس حالت میں بھی برف پینا رہ گیا تھا مگر صاحب بہادر کیسے بنیں اگر ایسا نہ کریں وہی مثل ہے۔

کلاغے تک کبک در گوش کرد تک خویشتن را فراموش کرد

ایک کوے نے چکور کی چال اختیار کی اپنی چال کو بھول گیا۔

ایک اور صاحب بہادر ریل میں سفر کررہے تھے اور ایک مولوی پرانے

(۱) ایک ٹوکرا روٹیوں کا بھرا ہوا تیرے سر پر رکھا ہوا ہے اور تو روٹی کا ٹکڑا در بدر مانگتا پھرتا ہے: مثنوی: دفتر پنجم (۲) اس پر مزید زیادتی یہ ہے۔

خیال کے سیدھے سادھے چلن والے بھی اس درجہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ صراحی تھی اس میں انہوں نے پانی بھر کر رکھ لیا تھا کیونکہ راستہ میں پانی کی کمی تھی آپ صراحی کو دیکھ کر کہتے ہیں یہ کیا بھنگیوں کا سا برتن لیا ہے انہوں نے کہا جیسا میں ہوں ویسا ہی میرا برتن ہے چونکہ بیچارے سادے کپڑے پہن رہے تھے اور ایسے لوگوں کی آج کل کچھ قدر نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو یہ لوگ دقیانوسی خیال کا کہتے ہیں اس لئے انہوں نے ایسی بے باکی کی گفتگو کی صاحب بہادر کو اتفاق سے شدت کی پیاس لگی اور پانی ساتھ رکھنا خلاف تہذیب تھا اب لگے کن انکھیوں سے مولوی صاحب کی صراحی کو تکنے مگر شرم کے مارے مانگیں کیسے واقعی کریم النفسی اہل اللہ پر ختم ہے۔ مولوی صاحب کو ان کی حالت پر رحم آیا کوئی اور ہوتا تو کبھی رحم نہ کرتا۔ انہوں نے قرائن سے معلوم کرلیا کہ اس کو پیاس لگی ہے مگر شرم کی وجہ سے کہہ نہیں سکتے تو یہ مولوی صاحب بتکلف آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور تھوڑی ہی سی دیر میں مصنوعی خراٹے بھی لینے لگے تاکہ یہ صاحب سمجھیں کہ سو رہے ہیں جب اپنے خیال میں انہوں نے سوتا ہوا سمجھ لیا تو اپنی جگہ سے اٹھے صراحی سے پانی پینے کے ارادے سے یہ بھی چپکے چپکے دیکھتے رہے صاحب بہادر نے صراحی اٹھائی مگر ڈرتے جاتے ہیں کہ کہیں جاگ نہ جائیں مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا اس خیال سے کہ بیچارے غریب کو پانی پی لینے دو پیاسا نہ رہ جائے دیکھئے کیا حوصلہ ہے اہل اللہ کا غرض آپ نے خوب پانی پیا۔ جب پانی پی کر صراحی رکھنے لگے تو مولوی صاحب نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ہائیں! آپ نے بھنگیوں کے برتن سے پانی کیسے پی لیا اب تو بڑے خفیف ہوئے (۱) اور کہا معاف کیجئے میں اپنی بات کو واپس لیتا ہوں واقعی مجھ سے حماقت ہوئی پھر جو صاحب بہادر کو معلوم ہوا کہ مولانا کسی اسکول

(۱) شرمندہ ہوئے۔

کے پروفیسر بھی ہیں اب تو لگے تعظیم کرنے۔

ایسے لوگوں کا ایک فیشن یہ بھی ہے کہ سفر میں بستر بچھونا نہیں لیتے پانی کا برتن ساتھ نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ جہاں جائیں گے وہاں بستر بچھونا موجود ہے اور پانی اسٹیشنوں پر ملتا ہی ہے پھر کیا ضرورت ہے۔ کچھ نہ صرف غیر قوموں کی تقلید ہے خواہ اس میں تکلیف ہی ہو۔

ان کے اسی مذاق کی بناء پر میں نے الہ آباد میں ایک وعظ میں جنٹلمینوں سے خطاب کیا تھا کہ صاحبو! لندن سے داڑھی رکھنے کا فتویٰ آنے ولا ہے اخبار کی خبر ہے کہ لندن والوں نے اس پر رائے دی ہے کہ داڑھی رکھنی چاہیے اب قبل اس کے کہ وہ لوگ داڑھی رکھیں تم جلدی داڑھی رکھ لو کیونکہ اگر آپ اب نہ رکھی اور بعد میں تو ضروری ہی رکھو گے، تو لوگ مطعون کریں گے کہ اللہ ورسول ﷺ کے کہنے سے تو نہ رکھی اور لندن والوں کے کہنے سے رکھی اس لئے ابھی سے رکھ لو تا کہ بدنامی نہ ہو(۱)۔

اسی طرح علما کی اس بات کو کہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو محض دین کی خادم ہو اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاوے کسی نے نہیں مانا تھا مگر ابھی تھوڑے دنوں سے ہندوؤں نے یہ کام شروع کر دیا ہے ان کا خیال ہے کہ ایک جماعت مذہبی ایسی ہونی چاہیے جو صرف مذہب کی خدمت کرنے والی ہو اور کوئی کام اس کے متعلق نہ ہو بس دن رات یہی کام کیا کرے تو مسلمان بھی کچھ کچھ سمجھنے لگے۔

غرض ان کو شب و روز دنیا ہی مقصود ہے۔ مذہب کو یہ لوگ محض اس لئے اختیار کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ سے مصالح دنیا محفوظ رہیں۔ باقی دین کو دینی حیثیت سے اختیار نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینی امور کو از خود اختیار کرتے۔ اسی

(۱) جیسے علماء نے کہا کہ مردوں کا پاجامہ ٹخنے سے اونچا ہونا چاہئے تو اس پر اعتراض کیا ارے اب یورپی فیشن میں پنڈھلی کھلا ہوا برنولہ (پاجامہ) پہننا شروع کر دیا۔

کو پسند کرتے اور دوسری قوموں کے کیوں منتظر رہتے۔ بس ایک غلطی ان لوگوں کی یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود اور دین کو تابع قرار دیتے ہیں حالانکہ لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللّٰہ تجارت اور خرید وفروخت ان کو اللہ سے غافل نہیں بناتی۔ کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا خود مقصود نہیں بلکہ دین اصل مقصود ہے اگر دنیا مقصود ہوتی تو یوں فرماتے: ﴿لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِاللّٰه﴾ یعنی ذکر اللہ کے شغل سے تجارت میں غفلت نہیں ہوتی۔ اب تو یوں فرمارہے ہیں کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دین ہے۔

بعثت انبیاء کا مقصد

یہ مسئلہ تو مسلمانوں کے نزدیک بالکل بدیہی بلکہ حسی ہے کہ اگر دین مقصود نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ انبیاء علیہم السلام نے دنیا کمانے کے طریقے نہیں بتلائے صرف احکام بتلائے ہیں اور چونکہ عقلی مسئلہ ہے کہ فعل کا اثر قول سے زیادہ ہوتا ہے، اس لئے میں پوچھتا ہوں کہ اگر دنیا مقصود تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس کا نمونہ کیوں نہیں بنایا، اس طرح سے کہ آپ کا کوئی کارخانہ ہوتا اور بہت بڑا کارخانہ ہوتا، جیسے حضور ﷺ دین میں بے مثل نمونہ بنے تو دنیا میں بھی بنتے مگر احادیث دیکھ لیجئے کہ آپ کس چیز کا نمونہ تھے۔ اگر حدیث صحیح نہیں (جیسا کہ ان میں سے بعض کا خیال ہے) تو تواریخ تو موجود ہیں (تواریخ ان حضرت کا دین ایمان ہے) تواریخ میں حضور ﷺ کے حالات دیکھئے کہ کیا تھے، معلوم ہوجائے گا کہ دنیوی اعتبار سے آپ ﷺ کی کیا حالت تھی۔

حضور ﷺ کا حال

میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ حضور ﷺ نے جب تادیباً اپنی بیبیوں

کے پاس نہ جانے کی ایک مہینے کے لئے قسم کھالی تھی اور مشہور یہ ہوگیا کہ حضور ﷺ نے سب کو طلاق دے دی ہے اور اس پر سب لوگ رو رہے تھے۔ اس حالت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی مگر اجازت نہیں ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شبہ ہوا کہ شاید آپ ﷺ کو خیال ہوا کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنے آئے ہیں اور اگر ایسا ہوا تو ان کی سفارش ماننی پڑے گی اس لئے اجازت نہیں ملی۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے پکار کر عرض کیا کہ میں حفصہؓ کی سفارش کرنے نہیں آیا، اگر حضور ﷺ آپ فرمائیں تو میں حفصہ کا سر اتار لاؤں میں صرف واقعہ معلوم کرنے آیا ہوں۔ حضور ﷺ نے ان کو آنے کی اجازت دے دی۔

وہ حاضر ہوئے اس کے بعد ان کی نظر دولت خانہ کی ہیئت پر پڑی تو دیکھا کہ گدے میں کھجور کے پٹھے بھرے ہوئے ہیں اور کچھ چمڑے لٹکے ہوئے تھے بس یہ کائنات تھی حضور ﷺ کے سامان کی نہ بکس، نہ الماری، نہ میز، نہ کرسی، نہ بنگلہ، نہ کوٹھی، نہ اور کوئی ساز وسامان۔ اس حالت کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آنسو جاری ہوگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ قیصر وکسریٰ خدا تعالیٰ کے دشمن صلیب پرستی کرنے والے ان کے پاس تو یہ ساز وسامان اور آپ کی یہ حالت۔ آپ ﷺ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ آپ ﷺ کی امت پر دنیا کی وسعت فرمائیں۔ حضور ﷺ کے ادب سے یہ نہیں کہا، کہ آپ ﷺ پر وسعت فرمادیں جیسے کہتے ہیں کہ آپ کے خادموں کو ایسا کردیں، حضور ﷺ ان کی یہ بات سن کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔ افی شك انت یا عمر (۱) (اے عمر رضی اللہ عنہ! تم ابھی تک شک ہی میں ہو)

ان لوگوں کو تو جو ملنا تھا سب کچھ دنیا میں مل گیا ہے، وہاں کچھ نہیں اور ہمارے لئے آخرت کی راحت ہے، یہ حضور ﷺ کا ارشاد اور یہ معاشرت۔ آج کل بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث مولویوں کی گھڑی ہوئی ہے، میں کہتا ہوں

(۱) مسند الامام احمد ۱:۳۴، سنن الکبریٰ للبیہقی ۷:۳۸، تفسیر ابن کثیر ۸:۱۹، کنز العمال: ۴۶۶۳

کہ تمہارے نزدیک تاریخ تو گھڑی ہوئی نہیں، تاریخ ہی کو دیکھ لیجئے کہ حضور ﷺ کے یہاں دنیا کم تھی یا زیادہ سو حدیث میں بھی ہے اور تاریخ میں بھی ہے کہ دنیا آپ کے یہاں بہت ہی کم تھی، یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ کے یہاں مہمان آئے ہیں پوچھنے پر آپ کے سارے گھروں سے جواب آیا کہ گھر میں پانی تو ہے اور کچھ نہیں۔ کیا اس واقعہ سے نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صرف دین کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن ہی کو دیکھ لیجئے دین کے ساتھ کہیں دنیا کا مطلوبیت کے ساتھ نام بھی نہیں لیا گیا، جس جگہ ذکر ہے دین ہی کا بالذات (۱) امر فرمایا ہے، ایک جگہ بھی ایسی نہ ملے گی جہاں بالذات دنیا کی رغبت دلائی ہو۔

کسب حلال اور حب دنیا

باقی میں کسب حلال سے منع نہیں کرتا کسب الحلال فریضة حدیث ہے، پس کسب حلال تو فرض ہے، ہاں حب دنیا سے منع کیا جاتا ہے، جس کے بارے میں ارشاد ہے۔ حب الدنیا راس کل خطیئة (۲) (کہ دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے)

صاحبو! ایک تو ہے کسب دنیا اور ایک ہے حب دنیا کسب دنیا جائز اور بعض مواقع پر واجب اور فرض بھی ہے اور حب دنیا حرام ہے اور ان میں باہم تلازم (۳) نہیں نہ کسب دنیا کے لئے حب دنیا لازم اور نہ حب دنیا کے لئے کسب دنیا لازم، کیونکہ کسب دنیا اس وقت بھی ممکن ہے کہ معاش حاصل کرے، مگر اس کے ساتھ شغف نہ ہو (۴)۔ اسی طرح حب دنیا اس وقت بھی ہوسکتی ہے کہ کمائے بھی نہیں، مگر اس کے ساتھ شغف ہو مثلاً کوئی شخص دنیا نہ کماتا ہو مگر دین سے بھی غافل ہو تو اس کو حب دنیا حاصل ہے اور کسب دنیا حاصل نہیں کیونکہ دین سے غفلت ہونا یہی حب دنیا ہے اور بعض جگہ دونوں جمع ہو جاتی ہیں، یعنی کسب دنیا بھی ہو اور حب

(۱) خصوصیت کے ساتھ (۲) کنز العمال: ۶۱۱۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۱۳، الدر المنثور ۶: ۳۴۱ (۳) یہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم نہیں (۴) لگاؤ ومحبت۔

دنیا بھی مثلاً ایک شخص دنیا بھی کماتا ہے اور دین سے بھی غافل ہے اور بعض جگہ دونوں نہیں ہوتیں نہ کسب دنیا نہ حب دنیا مثلاً کوئی شخص کسب دنیا نہیں کرتا اور دین سے غافل بھی نہیں، غرض حب دنیا وکسب دنیا متلازم نہیں ،بعض محبّ ہیں کاسب (۱)نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی کاسب ہو اور محبّ (۲) نہ ہو سو ہم حب دنیا سے منع کرتے ہیں۔ باقی کسب دنیا وہ تو خاص قیود کے ساتھ ضروری ہے آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ شرعی فتوے سے تجارت فرض کفایہ ہے اسی طرح زراعت بھی فرض کفایہ ہے کیونکہ زندگی موقوف ہے ان چیزوں پر اور ضروریات معاش کی تحصیل فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ بعض کے کر لینے سے بقیہ لوگوں کے ذمہ سے فرض ساقط ہوجاتا ہے اس لئے یہ خیال بالکل ہی غلط ہے کہ علما کسب دنیا سے منع کرتے ہیں بھلا فرض کفایہ سے کون منع کرسکتا ہے۔ بس محبّ دنیا ہونا تو کسی کو جائز نہیں باقی کسب دنیا میں کسی قدر تفصیل ہے یعنی ایک وہ شخص ہے کہ جس کو کسب دنیا ضروری ہے اور بعض وہ ہیں جن کے لئے کسب دنیا ضروری نہیں بیان اس کا یہ ہے کہ جس شخص کو عدم کسب (۳) کی حالت میں پریشانی ہو تو پریشانی کی حالت میں کسب دنیا ضروری ہے (۴) اس کو چاہیے کہ کسب دنیا کرے۔

علما اور کسب دنیا

ایک وہ لوگ ہیں کہ ان کے دنیا میں نہ مشغول ہونے سے کسی کا ضرر نہیں، نہ ان کا، نہ اہل عیال کا سو یہ لوگ اگر کسب دنیا نہ کریں تو کچھ حرج نہیں، خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگر وہ دنیا میں مشغول ہوں تو دین کی خدمت نہ کرسکیں، ان کے لئے کسب دنیا مناسب نہیں، بشرطیکہ ترک کسب سے تشویش میں نہ پڑیں، اللہ کے ایسے بندے ہر زمانہ میں ہوئے ہیں، مگر ایک جماعت ہے دنیا پرستوں کی وہ ایسے

(۱) بعض محبت رکھتے ہیں کماتے نہیں (۲) کمائے اور محبت نہ رکھے (۳) دنیا نہ کمانے سے پریشانی ہو (۴) دنیا کمانا ضروری ہے۔

حضرات پر طعن واعتراض کرتے ہیں کہ یہ اپاہج ہیں آرام طلب ہیں، حالانکہ یہ مسئلہ عقلی بھی ہے، چنانچہ اس مضمون کو ایک مسلم عندالعقلاء (عقلمندوں کے نزدیک) مثال سے سمجھاتا ہوں جو بالکل مذاق جدید کے موافق ہے۔

وہ یہ کہ سرکاری قانون ہے کہ جو شخص سرکاری ملازم ہو اس کو دوسرا کوئی کام تجارت وغیرہ کرنا ممنوع ہے، مثلاً کوئی شخص سرکاری ملازم ہے اور وہ ٹھیکہ لینے لگے تو سرکاری طور سے اس پر گرفت ہوگی۔ چنانچہ ایک شخص ملازم تھے انہوں نے ملازمت کی حالت میں مطبع کیا کچھ روز بعد کسی نے مخبری کردی ان پر شبہ ہوگیا بہت قصہ پھیلا گو پورا ثبوت نہ ہونے سے بری تو ہوگئے مگر وہ پریشان اتنے ہوئے کہ انہوں نے ملازمت ترک کردی۔

غرض سرکاری آدمی کو اجازت ہی نہیں کہ وہ دوسرا کام کرے مگر اس قانون پر کوئی روشن دماغ اعتراض نہیں کرتا لیکن اگر بڑی سرکار (یعنی اللہ میاں) کا کوئی ملازم ہو اور اس لئے وہ اسباب معاش کو ترک کردے تو اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ نکمے ہیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں تعجب ہے کہ اللہ میاں کے فتوے کی تصدیق نہ ہو اور حکام کے فتوے کی تصدیق ہو۔ قال اللّٰہ وقال الرسول (اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) پر قناعت نہ ہو اور قال الحکام پر قناعت ہو، میں گورنمنٹ کے اس قانون کا راز بتلاتا ہوں گو میرے ذمہ تو ہے نہیں مگر خیر تبرعاً بتلاتا ہوں (۱)۔

اس میں حکمت یہ ہے کہ ایک شخص دو طرف پورا متوجہ نہیں ہوسکتا اگر ملازم سرکار دوسرا کام کرے گا تو ضرور سرکاری کام میں خلل واقع ہوگا۔ اس لئے اس کو اجازت نہیں کہ بحالت ملازمت دوسرا کام کرے اسی طرح جو لوگ مولویوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا کی ترقی کیوں نہیں کرتے مشین اور کارخانے کیوں نہیں چلاتے تو وہ مثال مذکور کو پیش نظر رکھ کر خوب سمجھ لیں کہ جب یہ لوگ دنیا

(۱) بطور احسان کے۔

میں مشغول ہوں گے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا یہی ہوگا کہ دین کا کام نہ کرسکیں گے۔

علما کے کسب دنیا کا نقصان

ایک مولوی صاحب جو ایک دینی ملازم تھے مگر لکڑیوں کی تجارت بھی کرتے تھے، خود اپنا قصہ بیان کرتے تھے کہ مدرسہ کے وقت میں طلباء کو پڑھانے بیٹھے ہیں کہ گاہک آ گیا، اس نے لکڑی کا سودا کرنا چاہا بس مولوی صاحب کشمکش میں پڑ گئے اگر اٹھتے ہیں تو مدرسہ کا حرج اگر نہیں اٹھتے تو خریدار لوٹا جاتا ہے۔ مجبوراً اس سے کہتے ہیں کہ بھائی ابھی اٹھتا ہوں ذرا ٹھہرو۔ اس میں تھوڑا جھوٹ بھی تھا غرض ان کا دل بٹ جاتا سبق میں کچھ سے کچھ بیان کر جاتے پہلے تو طالب علموں کو ہنسی خوشی بتلا رہے تھے اب دل دوسری طرف ہوگیا۔ طلباء کچھ پوچھتے ہیں اور پوچھنے کے سبب اٹھنے میں دیر ہوتی ہے تو ان پر جھنجھلاتے ہیں غصے ہوتے ہیں۔ بس علما کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہی اثر ہوتا ہے کہ وہ دین کا کام پوری طرح نہیں کرسکتے۔

انہی کے متعلق ایک اور قصہ ہے کہ ایک روز میں راستہ میں جا رہا تھا ایک بڑھیا اپنے دروازے میں سے جھانک رہی تھی مجھ کو دیکھ کر بولی کہ بیٹا، یہاں آنا۔ میں گیا تو بولی کہ ایک مسئلہ تو بتا دو وہ یہ کہ زکوٰۃ دینا مدرسہ میں جائز ہے یا نہیں میں نے مسئلہ بتلایا پھر کہنے لگی کہ میں نے ان سے (یعنی لکڑیوں والے مولوی صاحب سے) بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی تمہارے موافق بتلایا مگر مجھ کو ان کا یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کو کہتے ہوں اب تمہارے بتلانے سے یقین ہوا کیونکہ تم پر یہ شبہ نہیں خیر میں نے بڑی بی کو سمجھا دیا کہ ایسا گمان علما پر جائز نہیں۔

یہ ہے علما کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ تو معلوم ہوگیا کہ مسائل تک میں ان کا اعتبار نہیں رہتا، میں کہتا ہوں جو لوگ علما کو مشورہ دیتے ہیں دنیا میں مشغول ہونے کا اگر علما ان کی رائے پر عمل کریں تو سب سے پہلے یہی لوگ ان کو مردود ٹھہرائیں گے۔ اس لئے علما کو یہ مشورہ مت دو کہ وہ دنیا میں مشغول ہوں

ان کے مشغول ہونے میں بڑی خرابی یہ ہے کہ خود تم کو ان کے فتاویٰ کا ان کے وعظوں کا اعتبار نہ رہے گا۔

علما کا کام

غرض علما کے دنیا میں مشغول ہونے کا یہ اثر ہے اسی لئے میری رائے یہ ہے کہ علما سے چندہ کی تحریک بھی مت کراؤ۔ انہیں چندہ وصول کرنے کے لئے مت مقرر کرو اس میں بھی ان کا اعتبار جاتا ہے میری رائے یہ ہے کہ چندہ کی تحریک رؤسا کریں ان کی تحریک کا اثر زیادہ ہوگا کیونکہ وہ خود بھی دیں گے علما کی طرف سے تو یہ خیال ہوگا کہ وہ دوسروں ہی سے کہنے کو ہیں خود کبھی کچھ بھی نہیں دیتے علما سے وہی کام لو جس کے لئے وہ ہیں۔ (یعنی ان سے دین سیکھو) مگر آج کل علما سے وہ کام لیا جاتا ہے جو ان کا نہیں ہے۔ کانفرنسوں میں لوگ علما کو صرف اس لئے بلاتے ہیں کہ ان کے قال اللہ اور قال الرسول کے ذریعہ سے خوب چندہ ہوگا۔ سبحان اللہ! مولوی کیا ہوئے بھاڑے کے ٹٹو ہوئے (۱) علما کو بھی چاہیے کہ وہ ایسے امور سے احتراز کریں علما کا طرز تو وہ ہونا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ کا طرز تھا۔ حضور ﷺ کا تو یہ حکم تھا۔

وامر اهلك بالصلوٰة اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کرو۔ یہی ان کا طرز بھی ہونا چاہیے اور حضور ﷺ کو ارشاد ہے: ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ق وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (۲) یا آپ ان سے کچھ آمدنی چاہتے ہیں تو آمدنی تو آپ کے رب کی سب سے بہتر ہے اور وہ سب دینے والوں سے اچھا ہے۔

سو مانگنا علماء کا کام نہیں ان نصوص کی بناء پر ان کی شان کے بھی خلاف

(۱) کرائے کے خچر (۲) سورۃ مؤمنون: ۷۲۔

ہے، اور وہ بات بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی یعنی ان پر بدگمانی بھی ہوتی ہے اور رؤسا پر یہ بدگمانی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص پچاس روپیہ اپنی جیب سے دے گا تو اوروں سے پچاس لے سکتا ہے اور یہ رؤسا کر سکتے ہیں اس لئے علما کو چاہیے کہ وہ اس کام کو نہ کریں۔

علما وامراء کے اختلاط کا اثر

پھر یہ تحریک علما کے فرض منصبی میں بھی مخل ہوتی ہے چنانچہ ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ چندہ کے واسطے امراء کے دروازوں پر جانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی امیر کے پاس جائیں اور وہ شطرنج کھیل رہے ہوں تو ہم ان کو منع نہیں کر سکتے کیونکہ ہم اپنی غرض کو ان کے پاس جاتے ہیں اس لئے دینا پڑتا ہے۔ غرض ان مقاصد کے سبب علما کا اختلاط [1] امراء سے اچھا نہیں اکثر ان کے اختلاط سے خود مولوی بگڑ جاتے ہیں۔

ایک کابلی مولوی صاحب مجھ سے ایک حکایت بیان کرتے تھے کہ میں ایک وزیر ریاست کے پاس بیٹھا تھا وزیر صاحب داڑھی صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا حسین چہرہ دیا ہے مگر جو چیز چہرہ کی زینت ہے اس کو آپ مٹا دیتے ہیں۔ اس کہنے سے وہ کچھ شرما گئے ایک دوسرے مولوی صاحب ان کے ہاں اور بیٹھے تھے وہ خوشامد میں کیا کہتے ہیں داڑھی کبھی نہ رکھنی چاہیے اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں اور باہم زنا کرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ چکلہ آپ نے کیوں رکھ چھوڑا ہے اور باہر آ کر میں نے ان مولوی صاحب کو بہت لتاڑا اور کہا کہ تم کو خوف نہ ہوا کہ ایسی باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم جب مکان سے چلتے ہیں ایمان تو فلاں نالہ پر چھوڑ آتے ہیں۔

(۱) زیادہ میل جول۔

سو علما کے لئے امراء کا اختلاط ایسا سم قاتل ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز علما کے پاس ہے (یعنی علم) امراء کو بزعم خود اس کی ضرورت نہیں اور جو چیز امراء کے پاس ہے یعنی مال علماء کو اس کی ضرورت ہے اس واسطے ان کو امراء کے پاس جا کر جھکنا پڑتا ہے اس لئے حق بات نہیں کہہ سکتے بس علما کو تو آزاد رہنا چاہیے اور ان کی آزادی کی یہ حالت ہونی چاہیے۔

زیر بار اند درختاں کہ ثمرہا دارند اے خوشا سرو کہ از بند غم آزاد آمد (۱)

اور اس آزادی کے ساتھ دین کی خدمت کرتے رہیں۔

علما اور تنخواہ

باقی یہ کہ پھر ان کی معاش کا کیا انتظام ہوگا سو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو توکل کریں یا پابندی سے جو خدمت کریں تدریس یا تبلیغ اس پر کسی مدرسہ یا انجمن سے تنخواہ مقرر کرالیں پھر اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ یہ تو پھر وہی دین فروشی ہوئی۔ سو میں اس کی تحقیق بتلاتا ہوں سنئے اصولی اور عقلی مسئلہ ہے کہ جو کوئی کسی کی خدمت میں محبوس ہو (۲) اس کا نفقہ اس کے ذمہ ہوتا ہے اور یہ قاعدہ تمام دنیا کے عقلاء کا معمول بہ ہے (۳) حتی کہ سلاطین تک کے لئے بھی یہی قانون نافذ ہے بادشاہ کو جو خزانہ سے تنخواہ ملتی ہے وہ بھی محض اس لئے کہ وہ رعایا کے کام میں محبوس ہے (۴) کیونکہ بادشاہ وہ ہے جس کو ساری قوم حاکم بناتی ہے اور اس کو بیت المال کے خزانہ سے تنخواہ دیتی ہے۔

اب یہ دیکھو کہ وہ خزانہ کسی چیز کا نام ہے اس کی حقیقت بتلاتا ہوں ساری قوم سے جو چندہ جمع کیا جاتا ہے کہ ایک پائی زید کی اور ایک پائی عمرو کی اور ایک پائی بکر کی جس کوٹھری میں اس کو جمع کیا جاتا ہے اس کا نام خزانہ ہے حقیقت اس کی وہی چندہ ہے وہ بھی قومی چندہ ہے اسی سے بادشاہ کو تنخواہ ملتی ہے صرف خزانہ کے

(۱) پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا ہے کہ غم کی قید سے آزاد ہے (۲) کسی کی خدمت میں مشغول ہو اس کا خرچہ (۳) ساری دنیا اس پر عمل پیرا ہے (۴) بادشاہ کو تنخواہ بھی عوام کے کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے ملتی ہے۔

لفظ سے اس کی عزت بڑھ گئی لوگ کہتے ہیں کہ یہ خزانہ شاہی ہے مگر حقیقت اس کی وہی چندہ قومی ہے پس یہی حقیقت اس چندہ کی ہے جس سے مولویوں کو تنخواہ یا نذر ملتی ہے مگر مولویوں کے حق میں چندہ سے تنخواہ ملنے کو لوگ ذلت سمجھتے ہیں اور بادشاہ کے لئے ذلت نہیں سمجھی جاتی ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ بادشاہ کو ایک لاکھ ملتے ہیں اس لئے ذلت نہیں خیال کی جاتی اور مولوی بیچاروں کو تھوڑی مقدار ملتی ہے اس لئے اس کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور الزام رکھتے ہیں کہ مولوی خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں مگر بغور دیکھئے حقیقت دونوں جگہ ایک ہی ہے اور جب حقیقت ایک ٹھہری تو جس نے چندہ میں سے ایک پیسہ لیا اس کی کم ذلت ہونا چاہیے اور جس نے زیادہ لباس اس کی زیادہ ذلت ہونی چاہیے۔

اب رہی یہ بات کہ بادشاہ کو خزانہ سے تنخواہ ملنے کے استحقاق (۱) کی علت کیا ہے سو اس استحقاق کی علت یہ ہے کہ وہ ملک کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے، کیونکہ وہ قوم کی خدمت کرتا ہے اس لئے اس کا نفقہ رعایا (۲) کے ذمہ ہے، اور بادشاہ پر کیا موقوف ہے سب کو چندہ قومی ہی سے تنخواہ ملتی ہے کلکٹر کو بھی، ڈپٹی کلکٹر کو بھی، جج کو بھی، منصف کو بھی۔ بس یہ مسئلہ عقلی ہوا اور اسی قاعدہ کو شریعت نے بھی تسلیم کرلیا جیسے زوجہ کا نفقہ اس کے شوہر پر اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس کے پاس محبوس ہوتی ہے (۳)۔

اب بتلایئے یہ علت علما کے استحقاق تنخواہ وغیرہ میں بھی مشترک ہے یا نہیں (۴) کیونکہ وہ بھی قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں (۵) اس لئے ان کا نفقہ بھی قوم کے ذمہ ہے کیونکہ جب تک وہ معاش سے فارغ نہ ہوں دین کا کام کر نہیں سکتے اگر ان کی خدمت نہ کی جاوے گی تو وہ کھائیں گے کہاں سے اور اس صورت میں ان پر کسی کا احسان بھی نہیں کبھی کوئی احسان کرنے لگے اس لئے کہ اگر

(۱) بادشاہ کے اس تنخواہ کے مستحق ہونے کی وجہ کیا ہے (۲) اس کے اخراجات کی ذمہ داری عوام پر ہے (۳) اس کے کاموں میں گھری ہوئی ہوتی ہے (۴) علما کے تنخواہ کے مستحق ہونے میں بھی یہی علّت پائی جاتی ہے کہ نہیں (۵) وہ بھی قوم کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

وہ تنخواہ وغیرہ لیتے ہیں تو آپ کی دینی خدمت بھی تو کرتے ہیں پاس آپ کے ذمہ تو ان کا قرض ہے اگر یہاں دنیا میں نہ دیا تو شاید آخرت میں اگلوائیں اور یہ دوسری بات ہے کہ وہ قیامت میں معاف کردیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ معاف ہی کردیں گے۔ غرض علما چونکہ قوم کی دینی خدمت میں محبوس ہیں اس لئے ان کی تنخواہ یا نذرانہ قوم کے ذمہ ہے البتہ خاص وعظ پر نذرانہ ٹھہرا کر لینا یہ ناجائز ہے باقی جو محبوس ہونے کے سبب تدریس یا تبلیغ پر تنخواہ لیں گے وہ جائز ہے ایسا نہ ہو تو پڑھنے پڑھانے کا اور تبلیغ کا سلسلہ ہی ختم ہوجاوے گا اور سارا دین درہم برہم ہوجاوے۔ اس تقریر سے دونوں باتوں کا جواب نکل آیا ایک تو یہ کہ مولوی تنخواہ وغیرہ کیوں لیتے ہیں دوسرے یہ کہ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں سو خوب سمجھ لو کہ اگر یہ لوگ خیرات کے ٹکڑے کھاتے ہیں تو بادشاہ اور وائسرائے اور جج کلکٹر سب ہی خیرات کھاتے ہیں اگر یہی بات ہے تو کسی کو بھی تنخواہ نہ لینی چاہئے کیونکہ سب کو قوم ہی کے چندہ سے تنخواہ ملتی ہے۔

آزمائش علماء

مگر اس تقریر سے کوئی مولوی صاحب دھوکہ میں نہ پڑجائیں کہ ہم تو دین کی خدمت کررہے ہیں اور ہماری تنخواہ نفقہ حبس ہے (۱) اس لئے ہم کاسب (۲) دنیا نہیں خوب سمجھ لیجئے اور اپنے معاملات میں غور کرلیجئے ان معاملات اور واقعات سے کاسب دنیا ہونے نہ ہونے کا اندازہ ہوجائے گا وہ معاملہ محل غور یہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب ایک جگہ نوکر ہیں دین کی خدمت کررہے ہیں اور پچاس روپے تنخواہ پاتے ہیں اور اس میں گزری اوسط درجہ کا ہورہا ہے تنگی بھی نہیں پچاس روپے کافی ہوجاتے ہیں اس حالت میں ایک اور جگہ سے خط آیا ملازمت کا کہ مبلغ سو روپے تنخواہ ملے گی یہاں چلے آؤ شاید کہیں طلباء نے بیچاروں کی تعریف کردی ہوگی۔ بعض مدرسین اس لئے بھی طلباء کی خاطر کرتے ہیں کہ کہیں مہتمم سے ان کی برائی نہ کردیں اور

(۱) ہماری تنخواہ کام میں گھرے ہوئے ہونے کے سبب ہے (۲) ہم دنیا کمانے والے ہیں۔

نوکری جاتی رہے اسی طرح بعض مہتممین بھی طلباء کی بہت خاطر داری کرتے ہیں اگر چہ وہ نا قابل ہی ہوں کہ کہیں مدرسہ سے چلے نہ جائیں جس سے مدرسہ کی رونق کم ہوجاوے پھر اس سے چندہ کم ہو جائے حالانکہ مدرسہ علمی کا مہتمم عالم باعمل ہونا چاہیے جو علم کے سبب تو بھلے برے کو سمجھتا ہو کیونکہ ناواقف ہونے کی صورت میں طلباء کی جرات بڑھتی ہے اور جو عالم ہوگا وہ سب باتوں کو سمجھے گا اور طلباء پر اس کا دباؤ ہوگا یا اگر مہتمم عالم نہ ہو تو کم از کم علماء باعمل کی صحبت میں رہا ہو ہر بات کو سمجھتا ہو اور حدود طمع وغرض سے پاک ہو خواہ اپنی غرض یا مدرسہ کی غرض سے تکثیر سواد یا تکثیر چندہ (۱) پر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کہیں طلباء نے مولوی صاحب کی تعریف کردی وہاں سے سو روپیہ تنخواہ کی ملازمت آ گئی اب اس سے دین یا دنیا کی طلب کا حال معلوم ہو جائے گا خلاصہ یہ کہ وہاں نئی جگہ میں نفع مالی بھی زیادہ ہے عزت بھی زیادہ ہے مگر دین کی خدمت کا موقع زیادہ نہیں بلکہ دین کی خدمت اس جگہ زیادہ ہے جہاں تنخواہ پچاس روپیہ ہے مگر کافی ہے اب دیکھا جائے گا کہ مولانا پگھلتے تو نہیں اگر لکھ دیا کہ میں نہیں آنا چاہتا ہوں میرا گزر ہو رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ مقصود ان کا دین کی خدمت ہے اور تنخواہ تبعاً لے رہے ہیں اور ان کی تنخواہ جزائے حبس (۲) اور میری تقریر کا مصداق ہے اور جو مولانا چل دیئے تو سمجھا جائے گا کہ مولانا دنیا دار ہیں۔ انہوں نے جو تنخواہ کو جزائے حبس (۳) بنایا تھا وہ صحیح نہ نکلا بلکہ محض دھوکہ تھا۔ اسی طرح جب مولوی صاحب کسی مدرسہ میں نوکر ہونے لگیں اور وہاں ایسی صورت ہے کہ جو تنخواہ ہم کو ملے گی ہمارا گزارا معمولی طریقہ سے اس میں ہوسکتا ہے اگر اس کو ہم نے بطیب خاطر اختیار کرلیا اور واقع میں ہمارے مناسب حال بھی یہی تھا کہ تین پانچ نہ کریں تو سمجھا جائے گا کہ تنخواہ لینا دراصل مقصود

(۱) افراد کی کثرت یا چندہ کی کثرت پر (۲) ان کے اس کام میں گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہے (۳) اس وقت محبوس کی جزاء بنایا تھا وہ درست نہیں۔

نہیں بلکہ اصل مقصود دین ہے اور اگر باوجود کافی ہونے کے پھر بھی تین پانچ کر کے تنخواہ طے ہوئی تو معلوم ہوگا کہ مولوی صاحب دنیادار ہیں۔

اب تو یہ حالت ہے کہ گاجر مولی کا سا مولویت کا بھاؤ ہونے لگا ہے لوگ بیس روپے تنخواہ کہتے ہیں اور وہ مولانا کے گزر کے لئے کافی ہے مگر مولانا کہتے ہیں کہ چالیس لوں گا جب رہوں گا، لوگ کہتے ہیں کہ تیس لے لیجئے مولانا کہتے ہیں کہ اچھا نہ ہمارا کہنا رہے نہ تمہارا بس پینتیس رہے، آپس میں جھگڑا تکرار ہو رہا ہے بالکل گاجر اور مولی کا سا سودا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول ہی نظر میں لوگوں کے دل سے اتر جاتے ہیں خیر کہنے سننے سے پینتیس قرار پا گئے پھر تھوڑے دنوں میں مولانا کے بچہ ہو گیا اب درخواست ہے کہ ہمارے ذمہ ایک خرچ آ گیا ہے ذرا خیال رکھئے گا اب اس جستجو میں ہیں کہ تنخواہ میں اضافہ ہو جائے وقتاً فوقتاً لوگوں کے کان میں یہ بات ڈالتے ہیں خیر لوگوں نے طوعاً وکرہاً چالیس کر دیئے پھر اس پر بھی قناعت نہیں سال چھ مہینے میں دوسرا بچہ ہو گیا اب پھر لوگوں کے سر ہیں درخواستیں کرتے کرتے لاتقف عند حد (۱) تک نوبت پہنچتی ہے پس اگر یہ صورت ہے تو دنیاداری ہے اور اگر دوسری صورت ہے کہ تنخواہ میں گزر ہونے کی صورت میں اس کو چھوڑ کر زیادہ تنخواہ پر نہیں گئے یا جو تنخواہ گزر کے قابل مل گئی منظور کر لی کچھ تین پانچ نہ کیا اور خدمت دین میں مشغول ہو گئے تو ایسے شخص کو کاسب دنیا نہ کہا جائے گا۔

یہ تو معیار تنخواہ کی صورت میں تھا، لیکن اگر کسی میں قوت توکل اعلیٰ درجہ کی ہو اور وہ تنخواہ وغیرہ سب چھوڑ دے تو سبحان اللہ! مگر ہر ایک کے لئے یہ صورت درست نہیں کیونکہ سب میں یہ قوت نہیں یا کسی میں قوت توکل خود اپنی ذات کے واسطے تو ہے مگر اہل وعیال میں قوت توکل ایسی نہیں ہے ایسے اگر تنخواہ نہ لیں تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں تو ایسے شخص کو بھی تنخواہ چھوڑنا درست نہیں کیونکہ یہ بھی ایک

(۱) کسی حد پر رکتے ہی نہیں۔

عبادت ہے کہ انسان اپنے اہل وعیال کی کوئی خدمت کرے ان کے حقوق کو ادا کرے غرض اس بات میں لوگوں کے مختلف حالات ہیں بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے بعض کو نہ ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اور ہونے سے اطمینان رہتا ہے پس جس کو جس طرح اطمینان اور جمعیت قلب حاصل ہو وہ کرنا چاہیے۔

اہل اللہ کا استغناء

میں نے جو ابھی عرض کیا ہے کہ بعض کو مال کے ہونے سے پریشانی ہوتی ہے اس پر تعجب نہ کیا جائے واقعی اللہ کے بعضے بندے ایسے بھی ہیں جن کو مال کی کثرت سے بار ہوتا ہے وہ یوں سمجھتے ہیں کہ جس قدر مال زیادہ ہوگا اس کے حقوق کا ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا اس لئے ایسے لوگ کثرت مال سے گھبراتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ایک صاحب مطبع میں ملازم رکھنا چاہتے تھے آپ نے فرمایا کہ علمی لیاقت تو مجھ میں ہے نہیں اس لئے بڑا کام تو کر نہیں سکتا البتہ قرآن کی تصحیح کرلیا کروں گا اس میں دس روپیہ ماہوار دے دیا کرو۔ (اللہ اللہ کیا تواضع اور زہد ہے)

اسی زمانہ میں ایک ریاست سے تین سو روپیہ ماہانہ کی نوکری آگئی مولانا جواب میں لکھتے ہیں کہ میں آپ کی یاد آوری کا شکر گزار ہوں مگر مجھ کو یہاں دس روپے ملتے ہیں جس میں پانچ روپے تو میرے اہل وعیال کے لئے کافی ہوجاتے ہیں اور پانچ بچ جاتے ہیں آپ کے یہاں سے جو تین سو روپے ملیں گے ان میں پانچ روپے تو خرچ میں آئیں گے آگے دو سو پچانوے جو بچیں گے میں ان کا کیا کروں گا مجھ کو ہر وقت یہی فکر لگا رہے گا کہ ان کو کہاں خرچ کروں اس لئے معذور ہوں اس لئے تشریف نہیں لے گئے۔

اسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھی لکھا تھا اور سو روپیہ

تنخواہ لکھی تھی مولانا نے دوسرا جواب دیا کہ میں آسکتا ہوں مگر تین سو روپے سے کم میں نہیں آسکتا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ مولانا ذرا سنبھل کر جواب لکھئے۔ اگر تین سو کی منظوری پر طلبی آگئی تو وعدہ پر جانا پڑے گا تو مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کے ساتھ یہ جملہ بھی بڑھادیا کہ مگر اس میں ایک شرط ہے وہ یہ کہ جب چاہوں گا یہاں رہوں گا جب چاہوں گا وہاں رہوں گا وہ رئیس صاحب سمجھ گئے کہ ان حضرات کو آنا ہی منظور نہیں اور واقعی جانا تھوڑا ہی منظور تھا مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بات ظرافت کے طور پر لکھ دی تھی۔

اللہ اکبر! کس قدر استغناء تھا ان حضرات میں واقعی اہل اللہ کے دل پر مال کی کثرت سے بھی بار ہوتا ہے ان کو خیال ہوتا کہ خدا جانے اس کے حقوق ہم سے ادا ہوں یا نہ ہوں۔

حکومت سلیمان علیہ السلام

میرے ذوق میں اسی لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو سلطنت دی گئی تھی تو اس کے ساتھ ان کی یہ خاص تسلی بھی حقوق ادا ہو سکنے یا نہ ہو سکنے کی کر دی گئی تھی ارشاد ہے: ﴿هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾(۱) کہ یہ ہماری عطا ہے خواہ کسی پر احسان کرو یا جمع کرو۔ یعنی عطاو امساک بالکل تمہارے اختیار میں ہے آپ پر کسی قسم کی پابندی نہیں تم سے اس کا کوئی حساب نہ ہوگا اس تسلی کے بعد ان کو سلطنت سے گرانی نہیں ہوئی ورنہ گھبرا جاتے اور ایک دن بھی بادشاہت نہ کر سکتے۔

اس آیت پر ایک بات یاد آگئی کہ آج کل تعلیم جدید والے ترقی دنیا پر اس سے دلیل پکڑتے ہیں اور کہتے ہیں کیا سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے معلوم ہوا ترقی دنیوی محمود ہے، اول تو ان لوگوں کو تمام انبیاء علیہم السلام میں دلیل پکڑنے کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ملے ہیں میں کہتا ہوں کیا اور انبیاء علیہم السلام دنیا

(۱) سورۃ ص:۳۹۔

میں نہیں ہوئے ان کے حالات بھی لینے چاہئیں دیکھ لیجئے کہ ان میں سے اکثر کی بلکہ قریب قریب کل انبیاء علیہم السلام کی کیا حالت تھی سب کی حالت قریب قریب فقر کی رہی ہے، دوسرے خود یہ استدلال بھی صحیح نہیں کیونکہ حکمت الٰہیہ سے ہر زمانہ کا ایک خاص مقتضا ہوتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بڑے بڑے جبار اور متکبر بادشاہ تھے، اس وقت کا مقتضا یہی تھا کہ نبی کو بطور معجزہ ایسی سلطنت دی جاوے، جس کا سب لوہا مان لیں اسی واسطے جانوروں اور ہوا تک پر ان کو حکومت دی گئی کہ تمام بادشاہ پست ہوگئے پس سلطنت ان کا معجزہ تھا یہ راز تھا، ان کی سلطنت میں ترقی دنیا مطلوب نہ تھی چنانچہ اس حالت میں بھی حسب نقل عارف رومی ؎

زار سلیماں خویش را مسکیں بخواند

یعنی آپ اپنے کو مسکین ہی کہا کرتے تھے اور اپنی ذات کے لئے بادشاہی سامان سے کام نہ لیتے تھے بلکہ حسب نقل بہشتی زیور اپنی دستکاری زنبیل سازی کے پیسوں سے کھاتے پیتے تھے اور بادشاہت سے گھبراتے تھے کہ مبادا حقوق کی ادائیگی میں کمی رہ جائے اس لئے آپ کے بارے میں ارشاد ہوا ﴿ فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ پس خواہ کسی پر احسان کرو یا بے اندازہ جمع کرو۔ کہ ہم ان حقوق کے متعلق آپ سے حساب نہ لیں گے آپ نہ گھبرائیے۔

جمعیت قلب

میں نے اوپر اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اصل چیز جمعیت قلب ہے جس طریقہ سے بھی حاصل ہو بعض کو پریشانی ہوتی ہے مال کے ہونے سے ان کے لئے مال کا نہ ہونا اچھا اور بعض کو جمعیت ہوتی ہے مال کے ہونے سے ان کے لئے مال کا ہونا اچھا ہر ایک کی حالت جدا ہے پس اگر کسی کو مال کے نہ ہونے سے تکلیف نہ ہو اسے چاہیے کہ خدا نے جس کام کے لئے اس کو پیدا کیا ہے بس صرف وہی کام کرے۔

اس بیان پر ایک شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ ادھر تو جوازاً یا اباحۃً(۱) یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں لگو اور اس کے ساتھ ہی یوں کہا جاتا ہے کہ غافل مت رہو دونوں باتوں کا اجتماع کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ جب دنیا میں لگا جاوے گا تو دوسری طرف سے غفلت ضرور ہوگی یہ تو وہ بات ہوگئی۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش(۲)

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض غیر محقق ہی کرے گا محقق کبھی یہ اعتراض نہ کرے گا۔ بات یہ ہے کہ امور غیر مطلوبہ دو قسم کے ہیں اختیاری اور غیر اختیاری امور غیر اختیاری میں تو ملامت نہیں وہ تو اختیار سے باہر ہیں انسان ان کا مکلّف(۳) نہیں کیا گیا حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ البتہ امور اختیاریہ پر ملامت ہے پس غفلت ایک تو اختیاری ہے اور ایک غیر اختیاری ہے غفلت اختیاری میں تو ملامتھے اور غیر اختیاری میں بالکل ملامت نہیں۔

مثلاً ایک نیک کام کیا جو توجہ کے ساتھ کرنا چاہئے تھا اور بلا اختیار اس میں غفلت ہوگئی تو یہ موجب ملامت نہیں اس صورت میں درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ کہاں ہے؟ کیونکہ اس میں ملامت ہی نہیں ہاں یہ سوچنا کہ قلب کی ایسی حالت کیوں ہے کہ دنیا میں لگ کر اللہ سے غفلت ہوجاتی ہے اور یہ سوچ کر غفلت دور کرنے کی تدبیر کرنا یہ امر اختیاری ہے اس اصلاح میں کوشش نہ کرنے پر بے شک ملامت ہے جیسا قرآن کا بلا اختیار غلط پڑھنا قابل ملامت نہیں ہاں صحیح پڑھنے کی کوشش نہ کرنا یہ اختیاری ہے اور قابل ملامت ہے۔

غرض یہ سوچنا کہ غفلت کا سبب کیا ہے پھر اس کی تدبیر کرنا یہ امر اختیاری

---

(۱) جائز یا مباح ہونے کی حیثیت سے (۲) گہرے دریا میں تو نے مجھے تختہ سے باندھ دیا ہے پھر کہتا ہے کہ ہوشیار رہ کہ دامن نہ بھیگے (۳) انسان سے ان کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔

ہے جب اس کا سبب سوچے گا یہ معلوم ہوگا کہ خدا کی محبت قلب پر غالب نہیں ورنہ غفلت کیوں ہوتی، جن حضرات میں خدا کی محبت غالب ہوتی ہے ان کے تمام کام خدا ہی کے واسطے ہوتے ہیں گو ظاہر میں وہ دنیا کے کام معلوم ہوتے ہیں ان کو دنیا میں لگ کر بھی خدا سے غفلت نہیں ہوتی۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کو اس کی معشوقہ نے بلایا اور وہ یہ چاہتا ہے کہ معشوقہ کے پاس اس ہیئت سے جاؤں کہ وہ دیکھ کر خوش ہو اس لئے حجام کو بلایا کہ وہ خط بنائے غسل کرے اچھے کپڑے پہنے اور اس کے بعد محبوبہ کے پاس جائے تو جو شخص عشق سے خالی ہے وہ اس کو اس شغل میں دیکھ کر یوں کہے گا کہ یہ تو اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف ہے محبوب سے غافل ہے مگر اس کو کیا خبر ہے کہ اس کی نیت ہر چیز میں محبوب ہی کے لئے ہے۔ کپڑے پہنتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب خوش ہوگا اور غسل کرتا ہے تو اس نیت سے کہ محبوب کو اچھا لگوں گا غرض اس کی ہر چیز میں محبوب ہی مقصود ہے جب یہ حالت ہے تو اس کو محبوب سے غافل کس طرح کہیں گے اگر تم بھی حق تعالیٰ کی محبت کو غالب کرلو تو دنیا کے ہر کام میں تمہارا بھی یہی حال ہوجائے گا اب جو ہم کو دنیا میں لگ کر خدا سے غفلت ہوجاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت حق غالب نہیں اور اس محبت سے مراد وہ محبت ہے جس کا انسان مامور ہے سو اس محبت کا غالب کرنا اختیاری ہے اس لئے ہمارے ذمہ ہے کہ محبت الٰہی کو دل میں غالب کریں۔ باقی اس کے اختیاری ہونے کی دلیل وہ مشاہدہ اور واقعات ہیں، آزما کر دیکھ لو تدبیر کر کے دیکھ لو خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ یہ امر اختیاری ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب گر دلیلت باید ازوے رو متاب

سورج کا نکلنا سورج کے وجود پر دلیل ہے اگر تم کو دلیل کی خواہش ہے تو اس سے منہ نہ پھیرو۔

جب اختیاری ہے تو اس کی تدبیر کیجئے اور ہر کام تدبیر ہی کرنے سے ہوتا ہے نری تمنا یا باتوں سے کچھ نہیں ہوتا اگر آپ چاہیں کہ تفریح کر کے اور محض وعظ سن کر کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہوسکتا۔

کارکن کار بگذار از گفتار کاندریں راہ کار باید کار

کام کرو باتوں کو ترک کرو اس راہ سلوک میں کام کرنا چاہئے کام۔

طریق تربیت

اب تدبیر کے متعلق یہ سوال ہوگا کہ کیا دنیا کو چھوڑ دیں یہ سوال اس لئے پیدا ہوا ہے کہ کسی غیر محقق کے ہاتھ میں پھنس گئے تھے اس نے اس طرح بتلایا ہوگا اس نے بتلا دیا ہوگا کہ ایک وقت کھانا کھایا کرو۔ چھ مہینے میں بیوی بچوں کو دیکھ لیا کرو نیز طاقت سے زیادہ کام بتلا دیا ہوگا کیونکہ آج کل کے پیروں میں یہ بھی ایک مرض ہے کہ وسعت سے زیادہ کام بتلا دیتے ہیں جس سے وہ پریشان ہو کر ہمت ہار دیتا ہے اور مایوس ہو جاتا ہے اسی واسطے مولانا شیوخ کو تعلیم فرماتے ہیں۔

چار پارا قدر طاقت بار نہ برضعیفاں قدر ہمت کار نہ

چار پایوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ لادو کمزوروں کو ان کی ہمت کے موافق کام دو۔

طفل را گرناں وہی برجائے شیر طفل مسکین را ازاں ناں مردہ گیر

بچہ کو اگر بجائے دودھ کے روٹی دی جائے تو بچہ کو اس روٹی سے مردہ سمجھ لو۔

اگر بچہ کو بوٹیاں کھلانے لگو گے تو اس کا پیٹ پھٹے گا یا نہیں اسی کی شکایت عارف شیرازی فرماتے ہیں:

خستگاں را چو طلب باشد وقوت نبود گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

کمزوروں میں جب طلب ہو اور قوت نہ ہو اگر تم ان کی ہمت سے زیادہ

کام دے کر ظلم کرو تو مروت کے خلاف ہے۔

یہ رسمی پیروں کو خطاب ہے جو محقق نہ ہوں شیوخ کو چاہیے کہ ہر ایک کی حالت دیکھ کر اس کے مناسب تعلیم کریں جیسے کوئی مریض طبیب سے یوں کہے کہ میں نادار ہوں قیمتی نسخہ کا متحمل نہیں ہوسکتا ارزاں نسخہ لکھ دو تو طبیب کو چاہیے کہ اس کی حیثیت کے موافق نسخہ تجویز کرے اسی طرح شیوخ باطن کو طالب کی طاقت و ہمت کا لحاظ لازم ہے۔ اگر کسی کو ایک سال کا دستور العمل ایک دن میں بتلا دیا تو وہ کس طرح کرے گا نتیجہ یہ ہوگا کہ کام چھوڑ کر بیٹھ رہے گا مگر اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور کام ہوجاوے کچھ نہ کچھ تو مشقت اٹھانا ہی پڑے گی۔ جو لوگ گھر بیٹھے کام بنانا چاہیں وہ اپنے گھر پر رہیں مشائخ کو پریشان نہ کریں۔

کامیابی کے لئے ضرورت برداشت

مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے ایک گودنے والے سے کہا کہ میری پیٹھ پر شیر کی تصویر بنادو تاکہ کمر میں قوت رہے وہ تصویر بنانے بیٹھا اور سوئی چبھوئی اس نے ایک آہ کی اور پوچھا کیا بناتے ہو! اس نے کہا کہ دم بناتا ہوں آپ بولے کہ دم نہ بناؤ یہ کوئی مکھیاں تھوڑا اڑائے گا اس نے دم چھوڑ کر دوسری طرف سوئی چبھوئی پھر آہ کی اور پوچھا کہ اب کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ سر بناتا ہوں آپ نے کہا یہ کوئی دیکھے گا تھوڑا ہی ایسے ہی رہنے دو۔ پھر اس نے پیٹ بنانا چاہا تو آپ کہتے ہیں کہ یہ کوئی کھائے گا تھوڑا ہی غرض جو عضو کو بناتا تھا آپ یہی کہتے تھے کہ اس کو کیوں بناتے ہو اس پر بنانے والے نے سوئی پھینک دی اور کہا۔

شیر بے گوش سرو شکم کہ دید ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

شیر بغیر کان اور سر اور پیٹ کا کس نے دیکھا ہے ایسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا میں کیا بناؤں گا۔

آگے مولانا فرماتے ہیں:

چوں نداری طاقت سوزن زداں از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

یعنی اگر تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ سوئی کو برداشت کرسکو تو شیر کا نام بھی مت لو۔

کامیابی تو کام سے ہوگی

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ چاہیں کہ رہیں تو اسی مرکز پر جس پر پہلے سے تھے اور کام ہو جاوے تو یہ نہیں ہوسکتا۔ دلی جانا ہو تو ذرا گھر سے ہٹو بھی تو سہی چلتے تو ہو نہیں اور چاہو کہ دہلی پہنچ جاویں تو کیسے ممکن ہے اور یہاں تو برخلاف مقاصد دنیا کے کوشش کے بعد ناکامی میں بھی کامیابی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کام کرنے کے بعد جو ناکام رہے وہ بھی عنداللہ کامیاب ہے مگر کام تو کرے باقی یہ نہیں ہوسکتا کہ رہو تو اسی چکر میں اور چاہو کہ ہمیں مقصود تک پہنچا دو تو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

صاحبو! مقصود بہت دور ہے وہ کیا ہے رضائے حق تعالیٰ جس کی مثال جنت کی سی ہے کہ جنت سے پہلے پل صراط ہے اور اس سے پار ہو کر جنت ہے اور جس طرح پل صراط پر رفتار ہر شخص کی مختلف ہوگی بعض بجلی کی طرح عبور کر جائیں گے اور بعض کی رفتار گھوڑے کے سوار کی سی ہوگی اور بعض کی اس سے کم اور بعض کی اس سے بھی کم۔ اسی طرح یہاں سلوک کا مقام اخیر یعنی رضا، جنت کے مشابہ ہے اور لوگ اس مقام تک مختلف طرق سے پہنچتے ہیں بعض جلدی اور بعض دیر میں بس جیسے پل صراط پر چلنے کے بعد جنت ملے گی اور بعد تکلیف کے راحت نصیب ہوگی اسی طرح یہاں بھی ہے کہ تکلیف کے بعد راحت نصیب ہوگی۔

باقی اس سے اطمینان رکھو کہ شیخ محقق تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ حرام نوکری بھی اس وقت تک نہ چھڑائیں گے

جب تک حلال میسر نہ ہو جائے کیونکہ افلاس بعض دفعہ کفر تک پہنچا دیتا ہے۔
کادالفقران یکون کفرا(۱) (تنگ دستی بعض دفعہ کفر کے قریب ہو جاتی ہے)
اس لئے محقق عوام کو دنیوی تعلقات ملازمت وغیرہ سے الگ نہیں کرتا۔ حرام نوکری سے بھی تدریجاً(۲) الگ کرتا ہے کہ پریشانی نہ ہو پھر بھی تعجب ہے کہ ایسا راستہ بے ضرر اور اس پر بھی ہم نہ چلیں صاحبو! محبت کا طریق گو کسی قدر مشکل تو ہے مگر محال نہیں بس کسی محقق سے تعلق پیدا کرلو صرف صالح مت ڈھونڈو مصلح کو ڈھونڈو تندرست کو مت دیکھو بلکہ تندرست کنندہ یعنی معالج کو تلاش کرو۔

شیخ وہ ہونا چاہیے جو خود بھی متقی ہو اور مصلح بھی(۳) ہو گو ایسا شیخ تمہارے دنیا کے کام نہیں چھڑائے گا مگر یہ بھی نہیں کہ تم تو کچھ نہ کرو اور شیخ تمہاری اصلاح کے غرض سے تمہارے پیچھے پیچھے پھرے کیونکہ اس کی جوتی کو غرض پڑی ہے جو تمہارے پیچھے پھرے گا بس ان اصول پر فوراً کام شروع کردو کل پرسوں کا انتظار مت کرو گو یہ دریائے ناپیدا کنار ہے(۴) مگر جب خدا تعالیٰ کا فضل شامل حال ہوگا تو ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن دوسرے کنارہ پر پہنچ ہی جاؤ گے میں مکرر کہتا ہوں اور اطمینان بھی دلاتا ہوں کہ تمہاری معاش میں خلل ہرگز نہ پڑے گا۔

طریق عمل

مگر یہ بھی نہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور پرہیز تو کرنا ہی پڑے گا اگر کسی مریض سے طبیب کہے کہ بھائی دوا پینا اور پرہیز کرنا اور مریض یوں کہے کہ حضور آپ ہی پی لیں آپ ہی پرہیز کرلیں تو ایسے مریض کو کیوں کر شفا ہوگی۔ شفا تو خود مریض کے دوا پینے اور پرہیز کرنے سے ہوگی باقی یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ اس

(۱) کنزالعمال: ۱۶۶۸۲، الدرالمنثور ۲: ۴۲۰، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۰۵۱ (۲) حرام نوکری بھی آہستہ آہستہ چھڑاتا ہے (۳) خود بھی نیک ہو اور اصلاح کرنی بھی جانتا ہو (۴) اگرچہ یہ ایسا دریا ہے جس کا کنارہ نظر نہیں آتا۔

طریق میں ذرا بھی تعب اور مشقت (۱) نہیں البتہ نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔ سو اس میں کیا مشقت ہے مثلاً پرائی عورت کو مت دیکھو چوری مت کرو سو اس میں کون سی مشقت ہے بلکہ یہ تو باتیں وہ ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے علاوہ ایصال الی المقصود (۲) کے اور بہت سی دنیوی مضرتوں سے بچ جاؤ گے پھر تمہارا نقصان ہی کیا ہوا دنیا بھی نہیں گئی بلکہ اور سنور گئی اور دین مل گیا بس صرف مقاومت (۳) کرنا پڑے گی نفس کی اور یہ کام تو ضرور کرنا پڑے گا۔ اب تمہیں غرض ہو تو تم اس طرف آؤ گے تم جانو باقی خدا تعالیٰ کو کوئی غرض نہیں کہ گھیر کر لاویں مگر جب آؤ سمجھ کر آؤ کبھی خام ہو سیں (۴) لے کر نہ آؤ کہ اس میں ایسی لذت ہوگی ایسے انوار ہوں گے کشف و کرامت ہوگی جب کچھ نہ ہو تو بعد میں کہو کہ دھوکہ ہی ہو گیا۔

جیسا کسی بدوی نے کلام اللہ میں یہ سن کر کہ خدا نے انجیر اور زیتون کی قسم کھائی ہے انجیر کھالیا تھا بہت اچھا معلوم ہوا پھر آپ نے زیتون بھی کھایا وہ بدمزہ اور کسیلا معلوم ہوا تو آپ کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ زیتون کی بے چھکے ہی قسم کھالی بڑا دھوکا ہوا۔

اسی طرح اس طریق کے زیتون میں کسیلا پن تو ہوگا مگر وہ زیتون ایسا ہے کہ لا شرقیة ولا غربیة (نہ مشرق میں نہ مغرب میں) پھر تو وہ زیتون ایسا اچھا لگے گا کہ کسی چیز کی بھی اس کے سامنے کچھ حقیقت نظر نہ آئے گی جیسے تمبا کو کھانے والوں کو تمبا کو اول کیسا برا معلوم ہوتا ہے مگر پھر اس سے زیادہ کوئی چیز مزیدار نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح جب کوئی مرچ کھاتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے مگر پھر وہی اچھی لگتی ہے کہ گھی بھی اس کے سامنے اچھا نہیں لگتا کیا خدا کے راستے کی چیزیں مرچ سے بھی کم ہیں یہ راستہ بھی اول اول قدرے دشوار اور بدمزہ معلوم ہوتا ہے مگر پھر تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس کی تحصیل میں جان و مال سب کچھ دینا گوارا

(۱) تھکاوٹ اور پریشانی نہیں ہوگی (۲) حصول مقصود کے علاوہ بہت سے دنیاوی نقصانات سے بچتا ہے (۳) صرف نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی (۴) بے جا خواہشات۔

کرلو گے۔ ذرا اس راستہ پر چل کر تو دیکھو میں کہاں تک تفصیل کروں۔ کیا تصوف کا لقمہ منہ میں بنا کر دے دوں۔ پکاؤ اور کھاؤ ترکیب ہم بتلا دیں گے۔ پہلے کچی روٹی پکاؤ گے پھر پھلکے پکانے لگو گے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ روٹی پکانے میں دھواں بھی ضرور لگے گا مطلب یہ ہے کہ اس طریق میں مقاومت نفس (۱) اور شیخ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی برداشت کرنی پڑے گی۔ جیسے روٹی پکانے میں دھواں اور آگ کی گرمی ضرور لگتی ہے۔

سختی مشائخ کی حکمت

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ بعض لوگوں پر تیزی فرماتے تھے اس پر ایک تعلق دار نے مجھ سے شکایت کی کہ گنج مراد آبادی میں تو غلامی کرنا پڑتی ہے اس لئے کوئی اور پیر بتلاؤ جہاں کچھ رعایت ہو بس اتنی سی بات پر برگشتہ ہو گئے صاحبو! اتنے چڑ کے تو لگیں گے ہی۔ مشائخ کی سختی تو برداشت کرنا ہی پڑے گی مگر وہ سختی عین حکمت اور مصلحت ہوتی ہے وہ بے فائدہ سختی نہیں کرتے بلکہ معالجہ کرتے ہیں امراض کا گو سمجھ میں نہ آوے۔

ہمارے ہاں خانقاہ میں ایک شخص تھے انہوں نے ایک دوسرے شخص کو امر بالمعروف کیا امر بالمعروف ہے تو اچھی چیز مگر مجھ کو ان کے طرز سے یہ محسوس ہوا کہ منشاء اس کا کبر ہے انہوں نے اپنے کو اچھا اور دوسرے کو حقیر سمجھ کر ایسا کیا ہے میں نے ان کو بلایا اور کہا کیا آپ محتسب ہیں یا کسی کی طرف سے مامور ہیں۔ انہوں نے اول اول بہت تاویلیں کیں مگر اخیر میں سمجھے میں نے ان کی یہ سزا مقرر کی کہ خانقاہ کے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کیا کریں چنانچہ وہ کرتے رہے پھر مکان چلے گئے وہاں بھی غالباً کرتے رہے جب میں نے دیکھا کہ مرض نکل گیا لکھ بھیجا کہ اب نہ کرو۔

انہوں نے ایک شخص سے بیان کیا واقعی مجھ میں یہ مرض تھا اور مجھ کو اس تدبیر

(۱) نفس کی مخالفت۔

سے اتنا نفع ہوا کہ دس برس کے مجاہدہ سے بھی نہ ہوتا کبھی برسوں کا علاج ایک آن میں ہوجاتا ہے غرض مشائخ کی سختی اور بدمزاجی میں اصلاح ہی ہوتی ہے اس کو سختی سمجھنا غلطی ہے۔

عادت اللہ

اسی طرح اس کے علاوہ ایک غلطی اور بھی ہے وہ یہ کہ یہ مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلانے کو ایک نظر میں غوث کردیا ایک نظر میں کیمیا بن گئے ایسی باتوں کو سن کر بعضے لوگ پیر کے بھروسا پر کام سے بیٹھ رہتے ہیں اور خیال کرلیتے ہیں کہ پیر ایک نظر میں ہم کو کامل بنادیں گے۔ ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سو یہ خیال بالکل غلط ہے کام اپنے ہی کرنے سے ہوتا ہے باقی بعضے واقعات جو مشہور ہیں کہ ایک نظر میں طالب کی کیمیا بن گئی سو یہ بھی ایک درجہ میں صحیح ہے مگر یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ اس اکسیر بننے سے پہلے کتنی دیر لگی تھی اور کیا کچھ ان کو کرنا پڑا تھا کتنے اور کیسے کیسے مجاہدے انہوں نے کیے تھے جب اکسیر بنے، ہاں عین اکسیر بننے کے وقت دیر نہیں لگی ایک نظر میں کام ہوگیا یہ ہے حقیقت واقعہ کی البتہ کہیں فرق عادت (۲) کے طور پر ایسا ہوگیا ہے کہ کچھ بھی نہیں کرنا پڑا صرف ایک نظر میں کام ہوگیا مگر یہ شاذ ونادر ہے۔ والشاذ کالمعدوم (نادر مثل نہ ہونے ہی کے ہے) عادۃ اللہ اسی طرح جاری ہے کہ کام کرنے سے ہوتا ہے جو بھی ہوتا ہے۔

شاہ بھیک صاحب حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب کے مرید ہیں ان کو ایک نظر میں کامل کردیا تھا مگر دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے کیا کیا تھا کتنی ریاضت ومجاہدے کئے تھے اس کے بعد یہ نوبت آئی ایک واقعہ ان کے مجاہدہ کا سنیئے۔

شیخ نے ایک روز کسی بات پر ان سے کہا کہ جاؤ یہ نکل گئے برسات آگئی گھر گرنے کو ہوگیا بی بی صاحبہ نے کہا، ایسے کاموں کا ایک تو آدمی تھا اسے ہی نکال دیا اب

(۱) خلاف عادت۔

گھر کی مرمت کون کرے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے نکال دیا ہے تم بلالو بی بی صاحبہ نے بلالیا شاہ بھیک صاحب ادب کی وجہ سے پاس نہیں گئے تا کہ حضرت شیخ کو ناگوار نہ ہو۔ بی بی صاحبہ نے کہا کہ بھائی بھیک چھت خراب ہوگئی کڑیاں ٹوٹ گئیں اس کو درست کردو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لائے چھت پاٹی مٹی ڈالی کوٹا پیٹا جس وقت یہ چھت کوٹ رہے تھے، شاہ ابوالمعالی گھر میں تشریف لائے معلوم ہوا کہ بھیک چھت کوٹ رہے ہیں اس وقت آپ روٹی کھانے بیٹھے تھے۔ روٹی ہاتھ میں لئے ہوئے صحن میں آئے اور فرمایا لومیاں بھیک! وہ آپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی چھت پر سے کود پڑے آپ نے ہاتھ پکڑ کر اٹھالیا اور لقمہ منہ میں دے دیا۔ بس ایک لقمہ میں کام ہوگیا اور کامل ہوگئے۔

سو یہ تو صحیح بات ہوئی کہ ایک نظر میں کامل ہوگئے مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ کتنی دقتوں کے بعد اور کتنے مصائب کے بعد سوکھی لکڑی میں آگ کتنی جلد لگتی ہے مگر سوکھتی ہے کتنے دنوں میں۔ شیخ کے پاس رہ کر پہلے اپنا گیلا پن تو دور کرو۔ اس کے بعد پھر آگ کا فوراً ہی اثر ہوگا۔ عارف شیرازی اسی کو تو فرماتے ہیں ؎

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند ۔۔۔ وندراں حکمت شب آب حیاتم دادند(۱)
کیمیایت عجب بندگی پیر مغاں ۔۔۔ خاک او گشتم وچندیں درجاتم دادند(۲)

اس میں طریقہ بھی بتلادیا کہ میں نے شیخ کا اتباع کیا تھا اس کی جوتیوں کی خاک بن گیا تھا اس لئے ایسا ہوا اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اختیاری ہے پھر کیا عذر ہے پس اس طریقہ سے غلبہ محبت پیدا کرلو پھر دنیا میں لگ کر بھی اللہ سے غفلت نہ ہوگی یہ ہے کامیابی اور فرضاً اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تب بھی اسی جماعت کے ساتھ مشہور ہوگے اور یہی معنی ہیں اس کے کہ اس طریق کی ناکامی میں بھی کامیابی ہوتی ہی ہوتی ہے اسی واسطے اہل طریق کہتے ہیں کہ کام کرنے والے اس طریق

(۱) کل رات صبح کے وقت غصہ وغم سے مجھ کو نجات دی شب کی ظلمت میں مجھ کو آب حیات دی (۲) پیر کامل کی اطاعت عجیب کیمیا ہے اس کے قدموں پر رہا اتنے درجات پائے۔

میں ضرور کامیاب ہی ہوتے ہیں ناکامی محض کسی کو نہیں ہوتی۔

ذکر اللہ

آگے فرماتے ہیں: ﴿عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾ یعنی وہ ایسے بندے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر اللہ اور نماز اور زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔ ذکر فعل قلب (۱) ہے اور نماز فعل جوارح عبادت بدنی ہے زکوٰۃ عبادت مالی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت وبیع ان کو نہ قلب کی عبادت سے غافل کرتی ہے نہ بدنی عبادت سے نہ مالی عبادت سے اس میں یہ بھی بتلا دیا کہ محض عبادت ظاہری کافی نہیں بلکہ قلب کو بھی عابد و ذاکر بناؤ اور ظاہر ہے کہ ذکر قلبی موقت (۲) نہیں کیونکہ اس میں تعیین وقت کی قید نہیں وہ تو ہر وقت ہوسکتا ہے کسی کام میں اس سے حرج ہی نہیں ہوسکتا بخلاف دوسرے اعمال کے جیسے نماز ہے مثلاً اس میں وقت کا اس لئے تعیین ہے اگر تعیین نہ ہو تو دوسرے ضروریات میں بڑی دقت پیش آئے اسی طرح زکوٰۃ بھی ورنہ مال ہی فنا ہو جاوے جس کا ضرر ظاہر ہے اور تعیین دوسرے دلائل سے ثابت ہے۔

پس مجموعہ دلائل سے یہ حاصل ہوا کہ نماز و زکوٰۃ تو وقت معین پر ادا کرو مگر ذکر ہر وقت کرو یعنی دل سے ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہو اسی کو کہتے ہیں ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو۔

بس اس میں ہر وقت لگے رہو خدا جانے کس وقت کام بن جاوے اور گو مقصود اس تقریر کا ذکر قلبی ہی ہے مگر وہ عادۃً پیدا ہوتا ہے ذکر لسانی سے اس لیے زبان کو بھی ذاکر بنانا چاہئے گو کسی وقت ذکر قلبی سے خالی ہی ہو وہ بھی اگر خلوص سے ہو موثر ہوتا ہے۔

(۱) ذکر دل کا کام ہے اور نماز ہاتھ پیر سے بدنی عبادت کرنے کا نام ہے (۲) دل سے ذکر کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔

ذکر لسانی کا فائدہ

شاید اس پر کوئی ناواقف کلام کرے کہ زبان سے نام لینے سے کیا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ قلبی توجہ نہ ہو میں کہتا ہوں کہ کھٹائی کا نام لینے میں تو یہ اثر مشاہد ہے کہ اس کے نام لینے سے منہ میں پانی بھر آتا ہے کیا اللہ کا نام اتنا بھی نہیں ہے کہ دل تک اس کا اثر پڑے۔

صاحبو! اعتراض مت کرو۔ اللہ اللہ کہہ لیا کرو پھر خود دیکھ لوگے کیا اثر ہوتا ہے۔ تجربہ سے یہی ترتیب ہے سلوک کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی سبح اسم ربك الاعلیٰ اپنے برتر رب کے نام کی پاکی بیان کرو۔

میں نے اس طرف اشارہ بیان فرمایا ہے اس میں لفظ اسم بڑھا کر ابتداء بیان فرمائی ہے سلوک کی، کہ اول اپنے رب کے نام کی تسبیح کرو اسی واسطے سبح ربك الاعلیٰ (اپنے برتر رب کی پاکی بیان کرو) نہیں فرمایا بلکہ اسم کا لفظ بھی لائے گویا یہ تعلیم فرمادیا کہ ابتداء نام ہی سے کرو اس سے آگے ترقی ہوجاتی ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں اور تسلی کرتے ہیں۔

از صفت و زنام چہ زاید خیال واں خیالش ہست دلال وصال

وصف اور نام سے کیسا خیال پیدا ہوتا کہ وہ اس کا خیال وصال کے لئے رہنما ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب یہ خیال مت کر کہ صفت اور نام سے کیا ہوتا ہے فرماتے ہیں کہ اس سے خیال پیدا ہوگا پھر وہی خیال رہنمائے وصل ہوجائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر فرضاً ذکر لسانی سے نفع موہوم بھی نہ ہو تب بھی محبوب کا نام لینے میں کم سے کم مزہ تو آوے ہی گا اسی کو ایک شاعر کہتے ہے۔

الا فاسقنی خمراً وقل لی ھی الخمر ولا تسقنی سراً متی امکن الجھر (۱)

(۱) کہ اے ساقی شراب پلاتا جا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے۔ خاموشی سے شراب مت پلا جب تک کہ شراب کا تلفظ کرنا ممکن ہو۔

ایسے مجنوں کی حکایت ہے:

دید مجنوں را یکے صحرا نورد در بیاباں غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم می نمودے بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا چیست ایں می نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلےٰ می کنم خاطر خود را تسلی میدہم(۱)

عشق کا خود مقتضا ہے محبوب کا نام لینا جب یہ سمجھ میں آ گیا تو بس چلتے پھرتے زبان سے اللہ کا نام لیتے رہو اس طور پر۔

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ الخ﴾ ''ان کو اللہ کی یاد سے نہ تجارت غافل کرتی ہے نہ خرید وفروخت'' اس کا ایک شعبہ تو حاصل ہو جائے گا اور اگر چند دن ایسا کر کے بھی اعتراض کرو کہ ہم نے تو ایسا کیا تھا مگر دل میں اثر نہیں ہوا تو وجہ یہ ہوگی کہ آپ نے اس نیت سے نہیں کیا ہوگا کہ دل میں اثر ہو اگر اس نیت سے کرو تو ضرور اثر ہوگا آگے ارشاد ہے۔

﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں کہ اس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔

اس میں عجب (۲) کا علاج ہے یعنی ان کو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا باوجود عبادت کرنے کے پھر بھی ڈرتے ہیں یہی مضمون دوسری آیت میں بھی ہے۔

﴿قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ﴾ ان کے دل ڈرتے ہیں اس بات سے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

---

(۱) مجنوں کو کسی نے جنگل میں دیکھا کہ تنہا بیٹھا ہوا اپنی انگلی سے ریت پر کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کس کو خط لکھ رہے ہو جواب دیا کہ میں اپنی محبوبہ لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے دل کو تسلی دیتا ہوں (۲) خود پسندی۔

پہلی آیت کے ترجمہ کا یہ حاصل ہے کہ وہ ڈرتے ہیں اس دن سے کہ الٹ پلٹ ہوجائیں گے اس میں دل اور آنکھیں، مطلب یہ کہ ان میں باوجود عبادت کے پھر خوف ہے عجب نہیں وہ اپنے اعمال کو ہیچ سمجھتے ہیں۔

تجلیات الٰہی

ایک مسئلہ یہاں سے اور مستنبط (۱) ہوتا ہے وہ یہ کہ جو عمل کو ہیچ سمجھے گا وہ ثمرات کا منتظر نہ ہوگا تو اس میں اس کی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو۔ جیسے آج کل اکثر کی یہ حالت ہے کہ جہاں دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے۔

حضرت حاجی صاحب ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے، کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ خدا تو نہیں غیر خدا ہیں، مگر یہ عجیب ہونے کے سبب ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے ان سے مزے لیتا ہے، حتی کہ بعض اوقات ان کو مقصود سمجھنے لگتا ہے، بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ ان کی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ اشد نہیں مگر لوگ ان ثمرات مانع ہی کو چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آویں تو ان کی طرف التفات نہ کرے۔

ان کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ کو لڈو دے کر یا پیسہ دے کر بہلاتے ہیں اسی طرح مبتدی سلوک کو اس رنگ آمیز سے بہلایا کرتے ہیں کہ نشاط سے کام میں لگا رہے سو مقصود کام ہی ہے اسی لئے اکثر یہ انوار عقلاء کو نہیں دکھائے جاتے بلکہ کم عقلوں کو دکھاتے ہیں تاکہ ذکر اللہ کا چسکہ لگ جاوے اور آگے کو قدم بڑھاوے اور میں جو ان انوار کی نفی کر رہا ہوں وہ بدرجہ مقصودیت ہے ورنہ فی نفسہ وہ محمود ہیں گو مقصود نہیں۔ ان کو مذموم نہ سمجھنا چاہیے۔ اگر خود آئیں آنے دو ان کے دور کرنے میں بھی پریشانی مت اٹھاؤ۔ اگر نہ آئیں تو مغموم مت ہو کیونکہ مقصودیت کے درجہ

(۱) ایک مسئلہ یہاں سے اور معلوم ہوتا ہے۔

میں تو ہیں نہیں۔ نہیں آتے بلا سے، مت آئیں۔

اظہار احتیاج

اس آیت میں یَخَافُوْنَ یَوْمًا (اس دن سے خوف کرتے ہیں) فرمایا یخافونہ نہ فرمایا۔ حالانکہ بظاہر یخافونہ زیادہ مناسب تھا کیونکہ اصل خوف کی چیز اللہ تعالیٰ ہیں۔

سو بات یہ ہے کہ اس میں ایک خرابی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض کو عروج کے مقام پر پہنچ کر فنا کا ایسا غلبہ ہوجاتا ہے جس سے وہ ماسوائے اللہ سے ایسا مستغنی ہوجاتا ہے کہ وہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے کہ نہ جنت کی پرواہ ہے نہ دوزخ کا ڈر۔ نہ یوم آخرت سے خوف صرف خدا ہی سے تعلق، محبت یا خوف رہتا ہے اور استغناء میں ایسا غلو عبدیت کے خلاف ہے۔ اس وقت شیخ کامل اس کو عروج سے نزول کی طرف لاتا ہے تاکہ اللہ کی چیزوں کو بے وقعت نہ سمجھے اور اپنے کو خدا کی سب چیزوں کا محتاج جانے، نہ کہ ان چیزوں کی ذوات کی وجہ سے بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے دیکھے۔

حضور ﷺ کا کتنا عالی مقام تھا مگر پھر بھی آپ جنت طلب کر رہے ہیں۔ جنت تو جنت، کھانے کے بعد حضور ﷺ فرماتے ہیں غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا یعنی ہمیں آپ کی ہر چیز کی حاجت ہے۔ ہم آپ کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں۔ ہم تو بندے ہیں ہر حال اور ہر چیز میں آپ کی عطاؤں کے محتاج ہیں۔

اہل طریق کا جو قول ہے کہ غیر اللہ سے مستغنی ہوجاؤ اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی مقصود سمجھنے لگے۔ اس سے استغناء ہونا چاہیے۔ باقی اس حیثیت سے کہ ان چیزوں کو تعلق ہے اللہ تعالیٰ سے اس حیثیت سے ان کے ساتھ تعلق رکھے تو اس سے استغناء نہ ہونا چاہئے بلکہ ان چیزوں کی طرف اپنے کو محتاج سمجھے یہ عین عبدیت ہے۔

پس آیت میں لفظ یوما لاکر سالک کو علو سے عبدیت کے مقام پر اتارتے

ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا سے تو کیوں نہ ڈرتے۔ وہ تو خدا کی چیزوں تک سے بھی ڈرتے ہیں پس یوماًلانے میں یہ نکتہ ہے۔ اور بعض مقام پر یخافون ربھم اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ فرمایا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ اصل خوف اللہ ہی سے ہونا چاہئے۔ اسی لئے صوفیا کرام کہتے ہیں کہ اگر عذاب بھی نہ ہو تب بھی خدا سے ڈرنا چاہئے۔

ہر عمل پر اجر

آگے فرماتے ہیں لیجزیھم اللّٰہ اس میں لام عاقبت ہے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفات ہوں گے ان کا یہ انجام ہوگا۔ ان کو یہ ملے گا احسن ما عملوا میں احسن اور ماعملوا جوانہوں نے عمل کئے ہیں ایک ہی چیز ہے۔ لفظ احسن سے یہ بتلا دیا کہ ہر عمل تمہارا احسن ہی ہے۔ پس یہ قید واقعی احترازی نہیں۔

جیسے ہم چنوں کو کھاتے ہیں تو پہلے کھلے کھلے انتخاب کر کے کھاتے ہیں اور پھر سب کو کھا جاتے ہیں۔ بے کھلے ہوئے بھی کھلے ہوؤں کے ساتھ کھا جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے کہ نیک عمل کیسا ہی ہو۔ سب احسن ماعملوا میں داخل ہے۔

سبحان اللہ! کتنی بڑی رحمت ہے اور کتنی بڑی تسلی فرمائی ہے اور کتنا بڑا انعام ہے ہم ناچیزوں پر۔ اور ہماری کتنی ہمت بڑھاتے ہیں قرآن میں تدبر کیا جائے تو جابجا رحمت اور تسلی نظر آئے گی۔ چنانچہ ایک موقع پر ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتے ہیں۔ واللّٰہ یدعوا الی الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔ اور اللہ تعالیٰ نماز اور زکوٰۃ کی طرف بلاتے ہیں۔

اگر ابتداءً یوں فرمادیتے تو ہم گھبرا اٹھتے اور دل توڑ دیتے۔ قلب پر بڑا بار ہوتا کہ بڑی مشقتوں کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ پس حق تعالیٰ نے یہ رحمت فرمائی کہ عبادت کی طرف بلانے کو سلامتی کے گھر کی طرف بلانا فرمایا ہے تاکہ دل کو رغبت پیدا ہو جاوے۔ پھر اس رغبت سے عبادت کی طرف دل بڑھے۔ واقعی کیا رحمت ہے۔ اس کے علاوہ رحمت اور دل بڑھانا اور دیکھئے وہ یہ کہ قاعدہ کے موافق

جزاء بقدر مجزی بہ کے ہوتی ہے یعنی جیسا عمل ہو ویسی ہی اس کی جزاء ہونی چاہئے۔ سو اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم نے جیسے اعمال کئے ہیں ویسی ہی جزا مل جاتی اور ہمارے اعمال کی حالت معلوم ہی ہے جیسے کچھ ہیں۔ چنانچہ اگر ہم بندوں کا کام ایسا ناقص کریں جیسا حق تعالیٰ کا کرتے ہیں تو ہم کو پوری اجرت تو کیا ادھوری بھی نہ ملے بلکہ سزا دی جائے تو قاعدہ مذکورہ کے موافق ہم کو اس صورت میں جزا ملنی چاہیے تھی۔ کہ دس برس یا بیس برس جنت میں رکھ کر پھر باہر کر دیئے جاتے کیونکہ محدود کی جزا قاعدہ کے موافق محدود ہی ہوتی ہے مگر کیا رحمت ہے اور کیسا ہمارا دل بڑھاتے ہیں کہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ﴾ اور زیادہ دیں گے ان کو اپنے فضل سے۔

کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے زیادہ دیں گے مطلب یہ ہے کہ اعمال تو ہمارے اس قابل نہیں مگر یہ ہمارا فضل ہے کہ استحقاق سے زیادہ دیتے ہیں۔ صرف تمہارے اعمال پر حصر نہیں رکھتے بلکہ ہم جنت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیں گے۔ اس میں تو شاید کسی کو یہ ناز ہوتا کہ ہمارے اعمال شاید بچے جیسے ہوں یعنی ان میں خاصیت ہو نشوونما کی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے فرمایا من فضلہ کہ تمہارے اعمال بچے وچے کچھ نہیں جتنے ہیں یہ محض ہمارا فضل ہے اور کچھ نہیں۔ آگے ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب روزی دیتے ہیں۔ یعنی کسی کو حق تعالیٰ پر حق اعتراض نہیں۔ اللہ میاں جس کو چاہیں بے حساب روزی دیں۔ ان کو کوئی روکنے والا نہیں۔ جس کو دیتے ہیں محض اپنے فضل اور مشیت سے دیتے ہیں جس میں کسی کو مزاحمت کا منصب نہیں بس آیت کا بیان ختم ہوا۔ ان اعمال کا آیت میں بیان ہے۔

اصلی مال

صاحبو! یہ ہے مومن کا اصلی مال۔ باقی جس کو ہم مال سمجھتے ہیں وہ مال نہیں بلکہ جو مآل (۱) میں کام آوے وہ ہے مال حقیقی (یعنی اعمال صالحہ) واللہ مال

(۱) آخرت۔

سے وہ راحت نہیں جو ان اعمال سے راحت ہوتی ہے۔ دونوں جہاں میں اسی کو ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو جو کہ مومن ہیں دنیا میں بھی پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے۔ یعنی ایسی زندگی جس میں راحت ہی راحت ہوگی یعنی اس سے دل کو سکون واطمینان ہوگا۔ اور آخرت میں ان کے نیک اعمال کی کامل اجرت دیں گے ایک جگہ اس کے مقابل ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ یعنی جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملتی ہے گزران تنگی کی یعنی دنیا میں۔ اور قیامت کے روز اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

یہ نتیجہ ہے خدا کی یاد سے غفلت کا کہ یہاں بھی مصیبت وہاں بھی مصیبت۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دنیا داروں کی یہاں بھی زندگی تنگ ہے۔ یہ حال ہے کہ مال و دولت تو ان کے پاس سب کچھ ہے مگر اطمینان وراحت جس کا نام ہے وہ میسر نہیں۔ بعض اوقات تو ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ موت کی تمنا کرتے ہیں اور اعمال صالحہ سے حال کا عیش بھی اور مال کا عیش بھی دنیا بھی اچھی اور آخرت بھی اچھی۔ اصلی مال اس کو کہنا چاہئے۔ دنیوی مال کو تو مال اسی لئے کہتے ہیں یمیل الیہ القلب یعنی اس کی طرف قلب مائل ہوتا ہے۔ پس اعمال صالحہ کو بھی مال کہنا اس وجہ سے درست ہے کہ وہ اس قابل ہیں کہ قلب ان کی طرف مائل ہو

تفسیر آیت

بس وعظ کا مقصود تو ختم ہوا۔ اب دو ایک باتیں تفسیر آیت کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ آیت میں رجال کا لفظ آیا ہے۔ عورتوں کا ذکر نہیں کیا۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو وہ تابع ہیں مردوں کے دوسرے دلالت النص (۱)

(۱) آیت عورتوں کے اس حکم میں داخل ہونے پر بھی دال ہے۔

کے طور پر وہ خود بخود ہی اس حکم میں اس طرح سے آ گئیں کہ یہ صفات جب مردوں کے لئے موجب مدح(۱) ہیں تو اگر کسی عورت میں ہوں تو وہ اور بھی زیادہ قابل مدح ہیں۔ عورت ہو کر ان صفات کو اختیار کرے، تو بڑی ہمت کی بات ہے۔ روح آیت کی اور ان سب صفات کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دل کو ایسا تعلق ہو کہ دوسرے تعلقات پر غالب آ جاوے۔ جیسا لا تلھیھم اس میں نص ہے۔ یعنی صفت تو اس کو عبدیت ہو، اور تعلق الوہیت سے ہو پس بندہ کا کمال یہی ہے کہ الوہیت اور عبدیت کو اس طرح جمع کیا جاوے۔ اور اس کی یہی صورت ہے کہ تعلق تو اللہ سے ہو اور شان عبدیت کی ہو۔

خلاصہ وعظ

بس اب بیان کو ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام ''خیر المال للرجال'' رکھتا ہوں۔ اس نام کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں عورت کو مال کہا گیا ہے اور یہ مال ہے تشبیہاً۔ اس لئے میں نے بھی اعمال کو تشبیہاً مال کہہ دیا اور چونکہ میں اس وقت تجارت گاہ میں ہوں جہاں تجار زیادہ ہیں تو شاید کسی کو ان میں سے یہ خیال ہوتا کہ تجارت مانع ہے آخرت سے اس لئے میں نے ان کے لئے مناسب مضمون اختیار کیا اور اس کی اچھی طرح تفصیل کر دی کہ تجارت مانع آخرت نہیں۔ البتہ آخرت کے اختیار کرنے سے دنیا کی قید اور اس کے ساتھ تعلق ضرور کم ہو جاوے گا سو اس کا کیا مضائقہ بلکہ یہ تو مفید ہے کہ پیر میں ایک بیڑی تھی وہ کم ہو گئی۔ بس یہ خلاصہ تھا بیان کا۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین (۲)

---

(۱) باعث تعریف (۲) اللہ تعالیٰ تمام پڑھنے والوں کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۱۵/ دسمبر ۲۰۱۳ء